رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

جلد ۲ عدد ۲

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمان پورہ اچھرہ - لاہور

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

اہم اعلان

میں کچھ عرصہ سے اس امر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ اپنی تالیفات کی طباعت و اشاعت کا کام کسی ایسے ادارہ کے سپرد کروں جو اصلاح فکر اور اصلاح معاشرہ کے اسی مقصد کے لئے کام کرنے والا ہو جس مقصد کو سامنے رکھ کر یہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ اب میں بمسرت اعلان کرتا ہوں کہ میری تمام کتابیں جن کی فہرست درج ذیل ہے آئندہ "مکتبہ المنبر" لائل پور کے زیر اہتمام شائع ہونگی اور چونکہ میں نے ان تمام کتابوں کا حق طباعت و اشاعت مستقل طور پر مکتبہ المنبر کے مالک مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کے نام منتقل کو دیا ہے اور وہی اب ان کتابوں کو چھاپنے کے مجاز ہیں۔ اس لئے کوئی اور صاحب ان کی اجازت کے بغیر ان کتابوں کو شائع نہ کریں۔

فہرست کتب

(۱) مجموعہ تفاسیر فراہی
(۲) دعوت دین اور اس کا طریق کار
(۳) حقیقت توحید
(۴) حقیقت شرک
(۵) تدبر قرآن
(۶) فقہی اختلافات اور ان کا حل
(۷) سفر حج
(۸) اسلامی قانون کی بنیادیں
(۹) اسلامی ریاست۔ غیر مسلموں کے حقوق
(۱۰) اسلامی ریاست۔ شہریت کے حقوق و فرائض
(۱۱) اسلامی ریاست۔ کارکنوں کی ذمہ داریاں
(۱۲) اسلامی ریاست میں قومیت کی بنیاد
(۱۳) اسلامی ریاست۔ اطاعت کے شرائط وحدود
(۱۴) اسلام میں ریاست کا تصور
(۱۵) توضیحات
(۱۶) تنقیدات
(۱۷) پردہ اور قرآن مجید
(۱۸) حقیقت نماز
(۱۹) اقسام القرآن
(۲۰) حقیقت تقویٰ
(۲۱) عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

امین احسن اصلاحی

رحمان پورہ اچھرہ - لاہور

اچھا ساتھی

دلچسپ با مقصد کہانیاں پیاری پیاری نظمیں، لطیفے، کارٹون۔ پلاٹ نویسی
انعامی مقابلے بہترین کہانیوں اور نظموں پر انعامات۔ اور بہت کچھ

بچوں کے ماہنامہ "اچھا ساتھی"

میں جنوری ۱۹۶۰ء کے اچھے شمارے میں ملاحظہ فرماویں۔
کتابت دلاویز۔ طباعت آفسٹ سائز ۲۰ × ۳۰ / ۸ - صفحات ۷۲ معہ سرورق
قیمت فی پرچہ صرف ۸ آنے۔ قیمت سالانہ چھ روپے۔ خاص نمبر سمیت۔

۱۹۶۰ء کے آغاز کا تحفہ رعایتی اعلان

جنوری ۱۹۶۰ء سے سالانہ خریدار بننے والے بچوں سے بجائے چھ روپے کے رعایتاً پانچ روپے لئے جائینگے۔ جو بچہ اپنے علاوہ اپنے کسی ایک دوست کو سالانہ خریدار بنائیگا اُسے دلچسپ کہانیوں کی پانچ عدد کتابیں بطور انعام دی جائینگی۔ اور "اچھا ساتھی" کی مدت خریداری میں تین ماہ کا اضافہ کر دیا جائیگا۔

ننھے قلمکاروں کے علاوہ ھند و پاک کے تمام اچھے ادیب "اچھا ساتھی" میں حصہ لے رہے ہیں۔

نوٹ:۔ ھندوستانی بچے ہندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو۔ پی) کو سالانہ قیمت روانہ کریں اور منی آرڈر کی رسید دفتر "اچھا ساتھی" کو بھیج دیں۔ پرچہ جاری کر دیا جائیگا۔

ایجنٹ صاحبان شرائط ایجنسی کیلئے دفتر سے رجوع فرمائیں۔

ماہنامہ "اچھا ساتھی"
۸ رحیم منزل۔ بارنس روڈ اسٹریٹ کراچی نمبر ۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۰۷

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ
مینیجر "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ

ماہنامہ میثاق لاہور

★

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۶۰ء مطابق رجب المرجب سنہ ۱۳۷۹ھ | عدد ۲

تذکرہ و تبصرہ ـــــ امین احسن اصلاحی ـــــ ۲

تدبر قرآن
تفسیر سورہ بقرہ ـــــ " ـــــ ۹

اسلامی قانون
اسلامی قانون کی تدوین ـــــ " ـــــ ۲۴

مراسلہ و مذاکرہ
پاکستان اور اسلامی تنظیمات - سرسید احمد خاں مرحوم بحیثیت ایک لیڈر، مصلح اور نجات دہندہ
مجتہدین، اجتہاد اور اجماع ـــــ ۳۱

سفر حج
سعودی حکومت کی بعض خدمات ـــــ ۴۳

تاریخ و سیر
عہد صحابہؓ کے سب سے کمسن مفسر قرآن ـــــ ۵۳

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

"میثاق" کی پچھلی اشاعتوں میں اصلاح معاشرہ کے جن پہلوؤں کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے بہت سے دردمندوں نے اُن کی اہمیت محسوس کی ہے۔ اس اثنا میں ہمیں جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بحمداللہ ہمارے اندر موجود ہیں جو صورت حال کی نزاکت کا احساس رکھتے ہیں اور دین کے بقاء و تحفظ کے لیے وہ اپنا وقت بھی صرف کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان میں سے جن کو خدا نے مال دیا ہے وہ اپنا مال بھی خرچ کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ ان خطوط سے ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے دردمندوں کی تعداد میں اضافہ فرمائے۔

کسی معاشرہ کے اندر ہزار خرابیاں موجود ہوں لیکن جب تک اس کے اندر ان خرابیوں کو محسوس کرنے والے اور ان کو دور کرنے کی راہ میں ایثار کرنے والے افراد موجود رہیں، اس وقت تک اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کسی معاشرہ کی حالت مایوس کن اس وقت ہوتی ہے جب اس کا بگاڑ اس حد کو پہنچ جائے کہ نہ اس کی اصلاح کے لیے اپنا وقت اور مال قربان کرنے والے باقی رہ جائیں اور نہ اس کی حالت پر غم کھانے والے۔ الحمدللہ ہمارا بگاڑ ابھی اس حد کو نہیں پہنچا ہے۔

لیکن ان خطوط سے جہاں ہمیں یہ اندازہ کرکے خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے وسایل و ذرایع اسلام کے تحفظ کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ ہیں وہیں انہی خطوط سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہوا ہے کہ ابھی اس معاملہ کے بعض گوشے لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح نہیں ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جب تک یہ گوشے اچھی طرح واضح نہیں ہوں گے اس وقت تک یہ احساس، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کرسکتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان پہلوؤں کی طرف بھی چند سطروں میں توجہ دلادیں۔

اس وقت جو لوگ اس مقصد کے لیے اپنے مال یا وقت کی کوئی قربانی دینا چاہتے ہیں انھیں دو باتوں پر اچھی طرح غور کرکے اپنے ذہن کو یکسو کرلینا چاہیے۔

ایک اس بات پر کہ اس وقت اسلام کے لیے جو مرحلہ درپیش ہے اِس مرحلہ میں اسلام کی خدمت کے لیے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ ضروری کام کیا ہے؟ دوسرے اس بات پر کہ اس وقت جو وسایل و ذرایع میسر ہیں ان کو اس مقدم اور ضروری کام کے لیے زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟

ان دونوں سوالوں پر غور کیے اور ان کے باب میں یکسو ہوئے بغیر جو کام اس وقت کیے جائیں گے ہمیں اندیشہ ہے کہ ان پر ہماری مادی و ذہنی طاقتیں تو صرف ہوں گی لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور ہوگا تو اتنا کم کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

پہلے سوال پر غور کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہ بات تو بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ بیمار ہے لیکن اس امر میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ بیماری کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ اس بیماری اور اس کے علاج کے متعین نہ ہونے کے سبب سے ہر تیماردار الگ الگ مرض تشخیص کررہا ہے اور الگ الگ اس کے علاج تجویز کررہا ہے۔ بعض لوگ اس کے ہاتھ پاؤں کو مریض سمجھ رہے ہیں اور اپنی اس تشخیص کے مطابق اس کے ہاتھ پاؤں پر مالش کرنا چاہتے ہیں۔ بعض اس کے پیٹ میں درد خیال کررہے ہیں اور اپنی سمجھ کے مطابق اس درد کی تسکین کی کوئی

دوا دینا چاہتے ہیں۔ بعض اس کو ضعف قلب کا مریض سمجھتے ہیں، وہ اس ضعف قلب کو دور کرنے کے لیے کوئی مقوی قلب چیز اس کو کھلانا چاہتے ہیں۔ غرض جتنے تیمار دار ہیں اتنی ہی تشخیصیں اور اتنے ہی علاج ہیں۔ یہ اختلاف تشخیص و اختلاف علاج اگرچہ زیادہ تر نتیجہ ہے اس ذہنی پریشانی کا جس سے ایک ہمہ گیر خرابی کے احساس نے ہمیں دوچار کر دیا ہے اور اس پہلو سے یہ ایک قدرتی سی چیز ہے لیکن کسی موثر اور نتیجہ خیز علاج کے لیے اس پریشان خیالی کا دور ہونا ضروری ہے جب کسی گھر میں آگ لگتی ہے تو بالعموم یہی ہوتا ہے کہ جس جس کونے سے بھی دھواں اٹھتا نظر آتا ہے پاس پڑوس کے ہمدرد اسی کونے کو آگ کا مرکز سمجھ کر اس پر اپنے اپنے پانی کے ڈول پھینکنے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ وہ از راہ ہمدردی کرتے ہیں لیکن ان منتشر کوششوں سے آگ نہیں بجھا کرتی۔ آگ بجھتی اس وقت ہے جب فائر بریگیڈ آگ کے اصل سنٹر کو متعین کر کے اس کو اپنے محاصرے میں لے لیتا ہے اور اپنے زوردار دونگڑوں سے اس کے سر غرور کو کچل کے رکھ دیتا ہے۔

دوسرے سوال پر غور کرنے کی ضرورت یوں ہے کہ اس مقصد کے لیے جو اسباب و وسایل اس وقت میسر ہیں یا آئندہ جن کے میسر آنے کی توقع ہے وہ بہرحال نہایت محدود بھی ہیں اور نہایت منتشر حالت میں بھی ہیں۔ اگر یہ اسباب و وسایل الگ الگ مختلف مقامات پر استعمال ہوں تو کبھی بھی ان سے کوئی بڑے پیمانہ کا کوئی ایسا نتیجہ خیز کام نہیں انجام پا سکتا جو اس ضرورت کو پورا کر سکے جس کو پورا کرنا پیش نظر ہے۔ پھر مادی وسایل سے زیادہ اہم سوال اس مقصد کے لیے ذی صلاحیت اور موزوں اشخاص کی فراہمی ہے۔ اس زمانہ میں کسی اس طرح کے کام کے لیے سرمایہ حاصل کرنا جتنا مشکل ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اس کے لیے اس دور قحط الرجال میں آدمیوں کی تلاش ہے۔

ان دونوں سوالوں میں سے جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس پر ہم نے جس حد تک غور کیا ہے ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہماری بیماری کوئی سرسری اور معمولی قسم کی نہیں ہے بلکہ بڑی گہری ہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد سے مغربی فکر و فلسفہ کی جو چھوت ہمیں لگی اس نے ڈیڑھ دو سو سال کی مدت میں ایک مزمن بیماری کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس نے ہمارے ذہین طبقہ کے

دماغ اور دل دونوں بالکل ماؤف کر دیئے ہیں۔ اس بیماری کا عمل تقریباً یکطرفہ قسم کا رہا ہے۔ اس کے تدارک کی تدبیریں یا تو اختیار ہی نہیں کی گئیں یا اختیار کی گئیں تو وہ اتنی سائنٹفک اور علمی نہیں تھیں جتنا سائنٹفک اور علمی اس کا عمل تھا، اس وجہ سے آہستہ آہستہ اس کے اثرات دماغوں اور دلوں کے اندر اتنے گہرے اتر چکے ہیں کہ اب اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان سے ہمارے ذہین طبقہ کی اکثریت کے عقائد و ایمانیات کی جڑیں تک ہل چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کے ذہین طبقہ کی بیماری اعضا و جوارح کی بیماری نہیں ہے بلکہ اس کے دماغ اور عقل کی بیماری ہے اور دماغ کی خرابی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج نہ تو درد کی دوا سے ہو سکتا ہے اور نہ ہر عطائی اس کا علاج ہی کر سکتا ہے۔

یہ مغرب کی فاسد عقلیت کا ایک عذاب ہے جو ہم پر مسلط ہوا ہے۔ اس فاسد عقلیت کا علاوا اگر ہو سکتا ہے تو اس صالح عقلیت ہی سے ہو سکتا ہے جو قرآن اور سنت کی حکمت کے اندر مضمر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دین کی عقلیت کے بھی رازداں ہوں اور جو موجودہ عقلیت کے مفاسد سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور ساتھ ہی اس معیار و پیمانہ پر اور اس انداز اور اس طریقہ سے اس کام کو کر سکنے کا سلیقہ رکھتے ہوں جو موجودہ زمانہ میں اس طرح کے کام کے لیے وجود میں آ چکا ہے۔ یہ ایک ٹھوس علمی اور تحقیقی کام ہے جس کا فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکنے کی توقع ہے جب ایک ٹیم پرسکون ماحول اور اطمینان بخش حالات کے اندر اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو دوسری تمام دلچسپیوں اور ہنگامی مشاغل سے فارغ کر لے اور اپنی محنتوں سے ان تمام زہروں کے تریاق بھی فراہم کرے جن سے اس وقت ہمارے معاشرے کا ذہین طبقہ مسموم ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کی تربیت بھی کرے جو آئندہ نسلوں کے لیے اس خدمت کو جاری رکھ سکیں۔

دوسرے سوال سے متعلق ہمارا مشورہ اسلام اور مسلمانوں کے ان تمام بہی خواہوں کے لیے جو اس عظیم خدمت میں اپنے وسایل و ذرائع سے حصہ لینا چاہتے ہیں یہ ہے کہ وہ اسلام کے وسیع

مفاد کے پیش نظر اپنے شخصی اور مقامی میلانات و رجحانات کو اس وقت بھول جائیں۔ پیش نظر کام ایک بڑا وسیع کام ہے، اس کو صحیح طور پر انجام دینے کے لیے بڑے وسیع اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے جس کے فراہم ہونے کی توقع صرف اسی شکل میں ہو سکتی ہے جب تمام اصحاب وسائل مل کر اپنی متحدہ کوشش سے فراہم کریں۔ متحدہ کوشش کی صورت میں تو بلا شبہ اس بات کی توقع ہے کہ اس کام کے لیے ضرورت کے مطابق سرمایہ بھی حاصل ہو جائے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس کام کو چلانے کے لیے موزوں اشخاص بھی مل جائیں۔ لیکن اگر وسائل رکھنے والے حضرات کسی ایک اسکیم پر متفق نہ ہو سکے تو اس صورت میں کسی بڑے کام کے انجام پا سکنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ بس یہ ہو سکے گا کہ بعض لوگ اپنے اپنے شہروں میں ایک آدھ بے مقصد قسم کے مدرسے اور قائم کر دیں گے یا اپنے دیہاتوں میں وعظ کہنے کے لیے ایک آدھ مبلغ بھیج دیں گے۔ اس سے ان مدرسوں کے بانیوں اور ان مبلغوں کے سرپرستوں کو تو ضرور تسلی ہو جائے گی کہ انھوں نے دین کی کوئی خدمت انجام دی ہے لیکن ان مدرسوں اور ان مبلغوں سے اس اسلام کا کیا بھلا ہوگا جس کی بنیادیں تک ہمارے معاشرے کے اندر ہل چکی ہیں۔

اس کام کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ ہم نے میثاق کی پچھلی اشاعتوں میں عرض کیا ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے عام معاشرہ کی دینی و اخلاقی اصلاح کی جدوجہد بھی شروع کی جائے۔ اس کا زوال و انحطاط اب خطرہ کے پوائنٹ تک پہنچ چکا ہے۔ اب اس کام میں مزید غفلت کے معنی اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے موت کے حوالہ کر دینے کے ہوں گے۔ ابھی تو اس بات کا امکان ہے کہ اگر سمجھ دار، بے لوث اور مخلص لوگوں کی ایک جماعت اس کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑی ہو تو شاید اللہ تعالیٰ اس کی کوششوں سے اس کی حالت کو سنبھال دے، لیکن اگر یہ کوشش نہ کی گئی تو زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا کہ اس کے لیے گمراہی کا ہر موڑ مڑ جانا بالکل متوقع ہے اور عند اللہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس کی اصلاح کے سلسلہ میں کچھ کر سکنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ جن لوگوں کے نزدیک سیاسی اقتدار کے حصول کے بغیر اصلاح معاشرہ کی کوئی جدوجہد ممکن ہی نہیں ہے انھیں ہم ان کے نظریے کی بنا پر مجبور سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ سیاست سے الگ رہ کر بھی اسلام کی

خدمت کر سکنے کے امکانات کے قائل ہیں ہم انھیں ان کی ذمہ داری یاد دلانا چاہتے ہیں۔ ان شاء اللہ میثاق کی آئندہ اشاعت میں ہم مسئلہ کے اس پہلو پر تفصیل سے لکھیں گے۔

۲

ادھر کچھ عرصہ سے طلبہ کی طرف سے، جن میں اکثریت دینی مدارس کے طلبہ کی ہے، مجھے اس مضمون کے خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ میں ان کی شعبان و رمضان کی چھٹیوں میں ان کے لیے درس قرآن کا سلسلہ شروع کروں۔ اس طرح کے خطوط مجھے پہلے بھی ملتے رہے ہیں لیکن میں نے ان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن ادھر جو خطوط مجھے ملے ہیں ان کی تعداد نے بھی مجھے متوجہ کیا اور ان میں علم قرآن کے حصول کے لیے جس ذوق و شوق کا اظہار کیا گیا ہے اس سے بھی میں بہت متاثر ہوا۔ جہاں تک اس کام کی افادیت کا تعلق ہے میں اس کا قائل ہوں اگرچہ ماہ ڈیڑھ ماہ کی مدت بہت تھوڑی ہے لیکن طلبہ ذہین ہوں تو اس قلیل مدت میں بھی بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن دینی مدارس کے طلبہ کی مجبوری یہ ہے کہ یہ بیچارے لاہور جیسے شہر کے مصارف قیام و طعام کے متحمل نہیں ہو سکتے اور میری اپنی حیثیت یہ ہے نہیں کہ میں ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری اٹھا سکوں۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان تمام بھائیوں سے معذرت کروں جنھوں نے مجھے خطوط لکھے ہیں۔ البتہ اگر کچھ ایسے طلبہ ہوں جو لاہور میں اپنے قیام و طعام کا انتظام خود کر سکیں تو ان تمام مصروفیات کے باوجود، جن میں اس وقت میں گھرا ہوا ہوں، ان شاء اللہ وقت دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔ مجھے یہ سطریں لکھتے وقت شرمندگی کا احساس ہو رہا ہے کہ میں قرآن کے طالبوں کے آگے یہ معذرت پیش کر رہا ہوں لیکن حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس معذرت کے سوا اس وقت مجھے کوئی اور چارہ نظر نہیں آیا۔ ویسے اب یہ مسئلہ میرے سامنے آ گیا ہے اور میں اس پر غور کر رہا ہوں۔ لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

۳

دسمبر کے میثاق میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ تفسیر آیۂ بسم اللہ و سورہ فاتحہ کا اتنا حصہ جتنا میثاق کے پہلے نمبر میں شائع ہوا ہے علیحدہ چھپوایا جا رہا ہے تاکہ میثاق کا پہلا شمارہ جن لوگوں کو نہیں مل سکا ہے ان کی پہلی جلد کم از کم تفسیر کے حصہ سے محروم نہ رہنے پائے۔ بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ تفسیر آیۂ بسم اللہ و تفسیر فاتحہ کا صرف تھوڑا سا حصہ چھاپنے کے بجائے آیت بسم اللہ و سورہ

فاتحہ کی پوری تفسیر کتابی صورت میں چھاپ دی جائے۔ جو لوگ اپنی فائل میں اس کو لگانا چاہیں گے وہ اس کو اپنی فائل میں بھی لگا سکیں گے اور کتابی شکل میں آجانے کے بعد علم قرآن کے دوسرے شائقین کے لیے بھی یہ ایک مفید چیز بن جائے گی۔ چنانچہ اس کی کتابت ہو رہی ہے اور خیال ہے کہ اچھے کاغذ پر اور اچھے اہتمام کتابت وطباعت کے ساتھ انشاء اللہ وسط فروری تک یہ تیار ہو جائے گی۔

اگرچہ اپنے حجم اور اپنے ظاہر کے لحاظ سے یہ ایک چھوٹی سی چیز ہوگی لیکن اپنی معنوی و روحانی قدر و قیمت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی چیز ہے۔ علم قرآن کے قدرداں اس کو خود بھی پڑھیں اور اپنے احباب اور اعزا کو بھی تحفہ میں دیں۔ ہم آیت بسم اللہ و تفسیر سورہ فاتحہ کی اسی تفسیر سے مکتبہ میثاق کی بسم اللہ کر رہے ہیں۔ اس مکتبہ کے ذریعہ سے ان چیزوں کی اشاعت مقصود ہے جو موجودہ زمانے کی فاسد عقلیت کا مقابلہ کر سکیں اور جن سے لوگوں پر دین حق کی حجت قائم ہو سکے۔ جن قدردانوں کو یہ کتاب اپنی فائل کے لیے یا مطالعہ کے　　یا تقسیم کے لیے جتنی تعداد میں مطلوب ہو اس سے اگر وہ پہلے سے باخبر کر دیں تو دفتر کو اس کی تعداد اشاعت متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس کا ہدیہ ۸ر سے زیادہ نہیں ہوگا۔

ہمیں توقع ہے کہ احباب و مخلصین مکتبہ کی اس بسم اللہ میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے، کیا عجب کہ ان کے تعاون سے ہم اس کے بعد سورہ بقرہ کی تفسیر بھی کتابی شکل میں چھاپنے کی ہمت کر سکیں اور پھر یہ سلسلہ آگے چل نکلے۔

تدبّر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۷)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ
فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ
لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا
رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ

وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۲۵
إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ
كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ
۲۶ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝
الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ ۲۷ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ
ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ ۲۸ هُوَ الَّذِي خَلَقَ
لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ
سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ ۲۹

ترجمہ: اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اوران کو بھی جو تم سے پہلے گذرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری روزی کے لیے۔ تو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درانحالیکہ تم جانتے ہو۔

اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، جو تیار ہے

کافروں کے لیے۔

اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اس بات کی کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے "یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں عطا ہوا تھا۔" اور ملے گا اس سے ملتا جلتا۔ اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے؟ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے والے ہیں۔

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا پھر وہ تم کو موت دیتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان استوار کر دیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

۲۱ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

یا ایھا الناس سے خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن یہاں مخاطب جیسا کہ اوپر گذرا خاص طور پر مشرکین عرب ہیں۔ اس خطاب کو مشرکین کے ساتھ مخصوص ماننے کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس کے بعد جو بات کہی گئی ہے، جو طرز استدلال اختیار کیا گیا ہے اور مخاطب سے جو مطالبہ کیا گیا ہے، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہاں خطاب کا اصل رخ مشرکین ہی کی طرف ہے۔

یہود کے ذکر کے بیچ میں یہ خطاب بطور ایک التفات کے آگیا ہے۔

اعبدوا ربکم : لفظ عبادت کی تحقیق سورہ فاتحہ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔ یہاں اعبدوا ربکم سے مقصود مشرکین کو صرف خدا کی بندگی کی دعوت ہی دینا نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ خدا کی بندگی کی اس دعوت کو قبول کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ اس کلام کی یہی پوشیدہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا کا ربط موزوں ہوا۔ یعنی پیغمبر جس بندگی کی دعوت دے رہے ہیں اس کو قبول کرو اور اگر تمہیں اس کتاب کے بارے میں شبہ ہے کہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے، خدا کی اتاری ہوئی نہیں ہے تو تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کرو۔

نیز اس کے اندر یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ تم خدا کی جس بندگی کے مدعی ہو وہ درحقیقت خدا کی بندگی نہیں ہے، خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ وہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔

خلقکم والذین من قبلکم : خلقکم کے ساتھ والذین من قبلکم کا اضافہ اس لیے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب اس بات کے تو قائل تھے کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اپنے بزرگوں میں سے انھوں نے بعضوں کو خدائی صفات میں شریک قرار دے کر خالق کی صف میں کھڑا کر دیا تھا اور ان کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگ گئے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے ساتھ ساتھ ان کے تمام اگلوں کو بھی عام مخلوقات الٰہی میں شامل کر کے اشارۃً اس بات کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ خدا کی بندگی کرنی ہے تو نہ صرف اپنے آپ کو مخلوق و مقہور مان کر خدا کے آگے جھکو بلکہ ان کو بھی خدا ہی کی مخلوق مانو جن کو تم نے اپنی حماقت سے خالق کا درجہ دے رکھا ہے۔

لعلکم تتقون : لعل مختلف معنوں کے لیے آتا ہے جن میں سے کسی چیز کے ممکن و متوقع نتیجہ کے بیان کے لیے بھی اس کا استعمال مشہور و معروف ہے۔ ہم نے اس کو اسی معنی میں یہاں لیا ہے اور جس سیاق میں یہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک اس کے یہی معنی صحیح ہیں۔

تتقون کے یہاں دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ دوسرے یہ کہ تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہاں دونوں معنوں کے صحیح ہونے کا امکان ہے لیکن ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس صورت میں اس کے مفعول کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اس محذوف کو قرآن نے

اس کے بعد والی آیت میں خود کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (۲۴ بقرہ) پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ : انداد ند کی جمع ہے جس کے معنی ہم سر، ہم پایہ، مدمقابل، مشابہ اور کفو کے ہیں۔

اہل عرب صفات باری سے متعلق ان تمام بنیادی مقدمات کو تسلیم کرتے تھے جن سے بدیہی طور پر توحید ثابت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ خدا کے شریک بھی مانتے تھے اس وجہ سے یہ فرمایا کہ جب تم خود اس بات کو جانتے ہو کہ خدا ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے، اسی نے تمہارے اگلوں کو پیدا کیا ہے، اسی نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا ہے، اسی نے آسمان کا شامیانہ تانا ہے، اسی نے آسمان سے پانی اتارا ہے اور اسی نے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے ہیں تو پھر ان کو خدا کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو جنھوں نے ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا ہے؟ یہاں جانتے ہو، کا مفہوم یہ ہے کہ ان ساری باتوں کو مانتے اور ان کا اقرار کرتے ہو۔

ادعوا شھداءکم : شہید، قوم کے اس لیڈر، ترجمان اور نمائندہ کو کہتے ہیں، جو اہم مواقع پر اس کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا ہے اور اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حمایتی انسانوں میں سے بھی ہو سکتے تھے اور اہل عرب کے اعتقاد کے مطابق جنوں میں سے بھی ہو سکتے تھے۔ عرب جاہلیت میں شاعروں اور خطیبوں کی بڑی عزت و عظمت تھی کیونکہ یہی لوگ تمام اہم مواقع پر قومی وقار کے محافظ بن کر کھڑے ہوتے تھے۔ مشرکین عرب یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوا کرتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کے متعلق بھی یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ بھی اسی قسم کے الہام کا کرشمہ ہے۔ ان کے انھی خیالات کی بنا پر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان یا جن کی گھڑی ہوئی چیز سمجھتے ہو تو اپنے ان حمایتیوں کی مدد سے اس کے مانند ایک ہی سورہ پیش کرو، اگر یہ تمہارے حمایتی اس نازک موقع پر بھی جب کہ تمہارے آبائی دین کے ساتھ ساتھ خود ان کی خدائی بھی معرض خطر میں ہے، تمہاری مدد کے لیے نہ اٹھیں تو سمجھ لو کہ یہ قرآن خدائی کلام ہے اور تمہارے یہ سارے دیوی دیوتا بالکل بے حقیقت ہیں۔ قرآن میں دوسرے مواقع پر اس مضمون کی وضاحت بھی موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ

يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (۸۸ - بنی اسرائیل)
"کہہ دو اگر تمام انس و جن متفق ہو کر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس کی مثال نہ پیش کر سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔" دوسری جگہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہوئی ہے۔ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ (۱۳-۱۴ ہود) "اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو، پس اگر وہ تمہاری امداد کو نہ پہنچیں تو سمجھ لو کہ یہ چیز اللہ کے علم سے اتری ہے۔"

ان کنتم صادقین :- "اگر تم سچے ہو" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم قرآن کے بارے میں جو گمان رکھتے ہو اگر اس میں سچے ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ خدا کے سوا تمہارے کچھ اور حمایتی اور مددگار بھی ہیں۔ اگر فی الواقع تمہارے کچھ حمایتی اور مددگار موجود ہیں تو ان کو مدد کے لیے بلاؤ، اس سے زیادہ ان کی مدد طلب کرنے اور ان کے تمہاری مدد کے لیے اٹھنے کا اور کون سا موقع اہم ہو سکتا ہے!

میرا اپنا رجحان اس دوسرے مفہوم کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلے مفہوم پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

وقودھا الناس والحجارۃ : یہ الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں جس سے قرآن کے ان جھٹلانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کے مرغوب ایندھن اول تو وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر کفر اور شرک کا مواد موجود ہوگا، انہی کے جسموں سے یہ آگ اپنے اصل رنگ میں بھڑکے گی۔ اور دوسرے درجہ پر اس کے ایندھن وہ پتھر ہوں گے جو معبود کی حیثیت سے دنیا میں پوجے گئے ہیں یا پوجے جا رہے ہیں کیونکہ اس پرستش کے سبب سے شرک کا وہ آتش گیر مادہ کچھ نہ کچھ ان کے اندر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس آگ کی محبوب غذا ہے۔

الحجارۃ کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ اس سے مراد یہی تراشے ہوئے پتھر ہیں جن کی دیوی دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی ہے۔ ان کو دوزخ میں پھینکنے سے مقصود در اصل ان کو عذاب دینا نہیں بلکہ ان کے پرستاروں کے عذاب میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح

ان کو دکھایا جائے گا کہ جن کے آگے وہ دنیا میں ڈنڈوت کرتے رہے ہیں اور جن کی ضیافت کے لیے دودھ اور حلوے پیش کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔

کفر کے شعائر کی توہین سے مقصود در حقیقت کفر کی توہین ہوتی ہے۔ اس ساری حقیقت کی وضاحت قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام میں خود فرما دی ہے:

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَا وَرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ (۹۸-۹۹ الانبیاء)

تم اور وہ چیزیں جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے، تم سب کو اس میں جانا ہوگا، اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو جہنم میں نہ پڑتے اور تم سب اس میں ہمیشہ رہو گے۔

جنت تجری من تحتھا الانھر : باغ کا سب سے زیادہ دلکش تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے منظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے اور سیلاب وغیرہ کی آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی کی ضمانت دیتی ہے۔ بلندی کے باغ کی تمثیل اسی سورہ کی آیت ۲۶۵ میں بھی موجود ہے کمثل جنۃ بربوۃ الآیہ۔ زیر بحث آیت میں تحتھا الانھر کے الفاظ سے یہ بات خود بخود واضح ہو رہی ہے کہ یہ باغ بلندی پر ہوں گے۔

قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل : قول کی کئی شکلیں ہوتی ہیں، ایک قول وہ ہوتا ہے جو سنا جاتا ہے، ایک قول وہ ہوتا ہے جو سِرّ ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ (۱۰ رعد) (یکساں ہیں تم میں سے وہ جو قول کو پوشیدہ رکھیں اور وہ جو اس کو ظاہر کریں) مجرد اشارہ کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ مثلاً:

فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا (۲۶ مریم)

اشارہ سے بتا دے کہ میں نے خدائے رحمان کے لیے روزے کی منت مانی ہے، آج میں کسی انسان سے کلام نہیں کروں گی۔

زبان حال و فعل سے جو اشارہ نکلتا ہے وہ بھی قول کی ایک شکل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جو بات آدمی اپنے دل میں کہتا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں مثلاً سورہ مائدہ میں منافقین کا حال بیان ہوا ہے:-

یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِیْبَنَا دَآىٕرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ (۵۲ - مائدہ)

وہ کہتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت نہ ہم پر آپڑے تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح لائے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات دکھائے اور ان کو اس بات پر نادم ہونا پڑے جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں

مذکورہ آیت میں ان منافقین کے دل کے خیال کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اور پھر یہ تصریح بھی فرما دی ہے کہ یہ ان کے دل کی چھپی ہوئی بات ہے۔ اسی طرح زیر بحث آیت میں قالوا سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں خیال کریں گے کہ دنیا میں ہمیں قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن نعمتوں کے مزے اپنی بشارتوں سے چکھائے تھے وہی نعمتیں ہمارے سامنے اب اپنی حقیقی شکل و صورت میں آرہی ہیں۔ یہ خیال ایک گہری مسرت، ایک عمیق احساسِ کامیابی اور ایک پرجوش جذبۂ شکر و سپاس کے ساتھ ان کے دلوں میں پیدا ہوگا۔ وہ خوش ہوں گے کہ الحمد للہ جن وعدوں پر وہ جیے اور مرے وہ سب سچے ثابت ہوئے اور جس جنت کی نعمتوں کے مزے اب وہ لوٹ رہے ہیں اس کی ایک تمثیلی سیر قرآن کی بدولت انھوں نے دنیا ہی میں کرلی تھی۔

اس ٹکڑے میں رزق کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ یہ لفظ عربی زبان اور قرآن میں رزق مادی اور رزق روحانی دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی کو رزق نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اصل رزق وہ علم و معرفت ہے جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اسی وجہ سے وحی کو قرآن نے رزق کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'مِن قبل' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں ایک یہ کہ اس سے پہلے دنیا میں، دوسری یہ کہ اس سے پہلے اسی جنت میں۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں تاویلوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے نزدیک جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ اشارہ دنیا کی طرف ہے۔ اس کے وجوہ آگے چل کر واضح ہوں گے

ازواج مطہرۃ: زوج کے معنی جوڑے کے ہیں، عورت کے لیے مرد جوڑا ہے اور مرد کے لیے عورت۔ انسان کے اندر قدرت نے خود ایک خلا چھوڑا ہے جو اس جوڑے کے سوا کسی

اور شکل سے پورا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس کے بغیر انسان کے لیے کسی نعمت کا تصور بھی کامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جنت کی میں بھی جو کمال نعمت کی تعبیر ہے، اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کے ساتھ مطہرہ کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کررہی ہے کہ نہایت اہتمام کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے اور ان کا تزکیہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اہل جنت کی رفاقت کے لیے پوری طرح موزوں ہوسکیں۔ یہ مفہوم لفظ مطہرہ سے نکلتا ہے اس لیے کہ تطہیر کے معنی ہی خاص اہتمام و توجہ کے ساتھ کسی کے عادات و خصائل اور طبیعت و مزاج کو سنوارنا اور پاکیزہ بنانا۔ سورۂ احزاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بہت سے ضروری آداب کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا ہے:-

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۳۳ - احزاب)

اللہ تو بس یہ چاہتا ہے، اے نبی کے اہل بیت کہ تم سے آلائشِ دنیا کو دور کرے اور تمہیں پاک کرے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔

ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلا: ضرب مثل کے معنی ہیں کسی حقیقت کو تمثیل کے پیرایہ میں سمجھانا۔ اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے اس وجہ سے روحانی حقائق کی تعلیم میں اس صنفِ کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ انبیاء اور حکماء کے کلام میں اس کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تورات اور انجیل پر ایک نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی بے شمار تمثیلات ہیں۔ قرآن میں بھی اس صنف کلام کی نہایت اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔

تمثیل میں جو چیز دیکھنے کی ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس میں جو حقیقت پیش کی گئی ہے وہ کتنی خوبی کے ساتھ پیش ہوئی ہے۔ اس چیز سے کچھ زیادہ بحث نہیں ہوتی کہ تمثیل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ ایک حقیقت کو نگاہوں کے سامنے مصوّر کردینے کے لیے جو چیز بھی مفید مقصد ہوسکتی ہے اس سے تمثیل میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے خواہ وہ مکھی ہو یا مچھر یا مکڑی۔ قرآن مجید نے مشرکین کے معبودوں کی بے بسی کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر مکھی بھی ان خداؤں سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس کا بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح مشرکاء اور شفعاء پر ان کو جو اعتماد تھا،

اس کی بے حقیقتی کی مثال مکڑی کے جالے سے دی ہے۔ یہود، دین کے اصولوں سے بے پروا ہوکر اس کی جزئیات کا جو اہتمام کرتے تھے حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کو مچھر کے چھاننے اور اونٹ کے نگل جانے سے تشبیہ دی ہے۔

یہ ساری تشبیہیں اور تمثیلیں اس اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ان میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ ان تمثیلوں کے پیرایہ میں نہایت خوبی کے ساتھ ایک عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علم اور معرفت کے قدردان ان تمثیلوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جو لوگ علم و معرفت کے دشمن اور خواہشات نفس کے غلام ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات سے بہت چڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمثیلات ان کے لیے وہ چیزیں بے نقاب کرتی ہیں جن کا بے نقاب ہونا ان کے نفس کی خواہشات کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ اپنا یہ غصہ جب نکالنا چاہتے ہیں تو براہ راست اس حقیقت پر حملہ کرنا تو ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو وہ تمثیل پیش کررہی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا آفتاب پر خاک ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ البتہ تمثیل کے کسی جزو کی آڑ لے کر وہ اس کے خلاف اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً فرض کیجیے تمثیل میں مچھر یا مکھی کا ذکر آگیا ہے تو خواہ وہ تمثیل کتنی ہی حقیقت افروز ہو لیکن وہ کہیں گے کہ "یہ کیا فضول تمثیل ہے، اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی ملتے ہیں" — اس طرح وہ خود اپنے ضمیر کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے کی کوشش کریں گے اور دوسروں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکیں گے۔

وما یضل بہ الا الفاسقین :۔ فسق کے اصل معنی خروج کے ہیں۔ یہاں سے یہ لفظ معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لیے استعمال ہوا۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ (۵۰ کہف) وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے مختلف مدارج ہوسکتے ہیں: منکر چھوٹا بھی ہوسکتا ہے اور بڑا بھی، اسی طرح نافرمانی معمولی درجہ کی بھی ہوسکتی ہے اور بغاوت کے درجہ کی بھی۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال

ہوا ہے بلکہ زیادہ تر اس کا استعمال ان بڑی نافرمانیوں ہی کے لیے ہوا ہے جن کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہوتا اس وجہ سے قرآن میں اس لفظ کو اس ہلکے معنی میں ہر جگہ نہیں لینا چاہیے جس معنی میں اس کو عام طور پر ہمارے فقہاء اور متکلمین نے لیا ہے۔

ویقطعون ما امر اللہ بہٖ ان یوصل :۔ اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے: ہمارے نزدیک اس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان توڑنے کے بعد دوسرا قدم جو ایک نافرمان اٹھاتا ہے وہ حقوقِ رحم سے بے پروائی یا ان میں بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ چونکہ تمام صلاح و فلاح اور تمام تمدن و معاشرت کی بنیاد اسلام نے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور رشتۂ رحم کے احترام پر رکھی ہے اس وجہ سے جو شخص ان دونوں پابندیوں سے آزاد ہوا اس کا ہر اقدام لازماً فساد فی الارض کا موجب ہوگا۔ چنانچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے اور رشتۂ رحم کے کاٹنے کا لازمی نتیجہ ویفسدون فی الارض بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں ان دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ ہوتا ہے گویا یہ لازم و ملزوم ہیں۔ مثلاً فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲ محمد) (پس اغلب ہے کہ اگر تم اعراض کرو تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رحمی رشتوں کو کاٹو)

ان دونوں کے اسی لزوم کے سبب سے قتادہ نے یہاں رشتۂ رحم ہی کو مراد لیا ہے اور ابن جریر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو عام رکھا ہے اور اس سے ہر اس چیز کا کاٹنا مراد لیا ہے جس کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ جہاں تک ظاہری الفاظ کا تعلق ہے اس معنی کو بھی غلط نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن سوال صرف ظاہری الفاظ کا نہیں بلکہ قرآن مجید کے طرز بیان کا ہے۔ قرآن نے یہ طرز بیان جہاں بھی اختیار کیا ہے موقع و محل دلیل ہے کہ رشتۂ رحم ہی کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس طرز بیان میں جو ابہام ہے اس سے رشتۂ رحم کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے کہ یہ ایسی واضح، بدیہی اور معروف حقیقت ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کا نام لیا جائے ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کو خدا نے کاٹنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا حکم دیا ہے اور تمدن اور معاشرے کی صلاح و فلاح کے پہلو سے جس کی اہمیت یہ ہے کہ جس نے اس کو کاٹا اس نے گویا تمدن اور معاشرے کی جڑ ہی پر کلہاڑا رکھ دیا۔

کیف تکفرون باللہ : کفر کے معنی کی تحقیق آٹھویں فصل میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں اس لفظ کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ یہ کہ یہ لفظ ان لوگوں کو مخاطب کر کے استعمال کیا گیا ہے جو خدا کے منکر نہیں تھے بلکہ صرف اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ البتہ قیامت کے یا تو وہ منکر تھے یا کم از کم یہ کہ اس کو بہت ہی بعید از قیاس اور بعید از عقل چیز سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے کہ تم اللہ کا کفر کس طرح کرتے ہو؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا ہے جس طرح خدا کا صریح انکار کفر ہے اسی طرح اس کا وہ ماننا بھی کفر ہے جو اس کی حقیقی صفات مثلاً وحدانیت، قدرت اور علم وغیرہ کی نفی کے ساتھ ہو۔

ثم استویٰ الی السماء فسوّٰھن سبع سمٰوٰت : استواء کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں اور الیٰ کے ساتھ اس کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ توجہ کرنے یا اس کے ہم معنی کسی مفہوم پر مشتمل ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا۔ محض تصویر حال کے لیے یہ اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں کھڑے ہونے یا متوجہ ہونے کا وہی مفہوم لینا چاہیے جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے شایان شان ہو۔

تسویہ کے معنی کسی شے کو برابر کرنے، ہموار کرنے اور اعتدال و توازن کے ساتھ قائم کر دینے کے ہیں۔ اس سقف نیلگوں کو جس حد تک ہماری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں، خواہ مجرد حالت میں یا سائنس کے ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے مسلح ہو کر، اس کے اندر کوئی رخنہ نہیں تلاش کر سکتیں۔ اسی چیز کو فرمایا ہے :-

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۚ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیۡرٌ (۳-۴۔ ملک)

تم خدائے رحمان کی صنعت کے اندر کوئی کسر نہ پاسکو گے، اپنی نگاہ دوڑاؤ کیا پاتے ہو کوئی رخنہ؟ پھر بار بار نظر دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر پلٹ آئے گی لیکن کوئی رخنہ نہ پاسکے گی۔

سما کا لفظ سما یسمو سے ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ یہ شامیانہ، جو ہمارے اوپر تنا ہوا نظر آتا ہے، قرآن اس کے عجائب اور اس کی نیرنگیوں کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے اور ان سے جن واضح

نتائج کی طرف رہبری ہوتی ہے ان کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کائنات کے مشاہدات سے متعلق قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں ہماری عام نگاہوں سے مخفی ہیں یا جو صرف گمان اور قیاس پر مبنی ہیں یا جو صرف خورد بینوں اور دور بینوں کی مدد سے ہی دیکھی جا سکتی ہیں، قرآن ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان میں بہت کچھ نزاع اور اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ قرآن ہمیں صرف انہی حقائق کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے جن میں کم از کم کسی انصاف پسند کے لیے کسی نزاع اور اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ آسمان کے حقائق کی طرف توجہ دلانے میں بھی قرآن نے یہی روش اختیار کی ہے۔ ان باتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے جن کو ثابت کرنے کے لیے صرف توجہ دلا دینا ہی کافی ہے۔ البتہ یہ اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آسمان سات ہیں تاکہ انسان اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی بس اس نظر آنے والی چھت اور ان چمکنے والے ستاروں ہی تک محدود ہے بلکہ اس پر واضح رہے کہ اس کے دلولۂ تفتیش و تحقیق کی جولانیوں کے لیے ان ستاروں سے آگے اور بھی میدان ہیں۔

۲۲۔ آیات ۲۱ - ۲۹ میں مطالب کی ترتیب

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں جو باتیں جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان خاص خاص چیزوں سے بحث کریں گے جو وضاحت اور تفصیل کی محتاج ہیں۔

اس مجموعہ کی ابتدائی آیات میں بنی اسمٰعیل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ انداز کلام اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ بندگی کی اس دعوت کو قبول کرے۔ اس میں ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے کہ جس طریقہ پر وہ خدا کی بندگی کر رہے ہیں یہ خدا کی بندگی نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس بندگی میں دوسروں کو بھی شریک کر رکھا ہے حالانکہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کائنات میں اس کے تصرفات اس طرح بیان کیے گئے ہیں جس سے اس کی توحید ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر اس دعوت کو قبول کرنے میں تم اس لیے جھجکتے رہے ہو کہ تمہیں اس قرآن کے اللہ کی طرف سے

ہونے میں شک ہے، تمہارے خیال میں یہ خود پیش کرنے والے یا ان کے کسی مددگار کی تصنیف ہے تو اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کی سورتوں کی طرح کی کوئی سورہ تصنیف کرکے پیش کردو۔ اس سے اس کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جائے گا، اس کام میں تم اپنے شاعروں، ادیبوں، خطیبوں، کاہنوں، جناتوں اور دیویوں دیوتاؤں میں سے جس کی چاہو مدد بھی حاصل کر سکتے ہو۔

اس کے بعد اس انجام سے ڈرایا گیا ہے جس سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو اس قرآن کا جواب پیش کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن اس کے منزل من اللہ ہونے کے دعوے کو جھٹلا رہے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو قرآن کی دعوت قبول کرکے ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کرلیں گے۔

جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں خاص بات جو یہاں کہی گئی ہے اور جو خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب جنت کی نعمتیں اہل جنت کے سامنے پیش کی جائیں گی تو وہ اس بات پر خوش ہوں گے کہ جو نعمتیں انھیں یہاں مل رہی ہیں وہ ان سے پہلے سے آشنا ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کے منکرین تو قرآن کو آج ایک من گھڑت افسانہ سمجھ رہے ہیں لیکن ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب پردہ اٹھے گا اور قرآن کی ایک ایک بات کی صداقت اس طرح سامنے آئے گی کہ اہل ایمان ہر ملنے والی نعمت پر خوشی سے باغ باغ ہوں گے کہ الحمد للہ قرآن کی بدولت اس جنت اور اس کی نعمتوں کی سیر ہمیں دنیا ہی میں کرا دی گئی تھی۔

اس کے بعد سلسلہ کلام کے بیچ میں ایک مناسب موقع تنبیہ بطور جملہ معترضہ کے آگئی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ جنت اور اس کی نعمتوں کا جو ذکر ہوا ہے یہ بہرحال بشکل تمثیل ہے کیونکہ اس دنیا میں جنت اور دوزخ سے متعلق جو بات بھی سمجھائی جا سکتی ہے تمثیل ہی کے ذریعہ سے سمجھائی جا سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارا سمجھانا اس قدر مطلوب و محبوب ہے کہ وہ ہر اس تمثیل کو تمہاری تعلیم کا ذریعہ بناتا ہے جس سے حقیقت تمہارے ذہن نشین ہو سکے، عام اس سے کہ یہ تمثیل کسی مکھی کی ہو یا مچھر کی۔ جو لوگ علم اور حقیقت کے جویا ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات کی قدر کرتے ہیں اور ان سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جو ضلالت کے طالب

ہوتے ہیں وہ ان تمثیلوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے سبب سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر اشارۃً چند لفظوں میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں صفات کے لوگ ہیں جو ان تمثیلات سے علم و معرفت کے بجائے ضلالت اور گمراہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ تمام صفات یہود پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اس طرح گویا بنی اسمٰعیل کو متنبہ کیا گیا کہ نہ تو تم خود تمثیلات کے بارے میں اس قسم کی بیہودہ حجت طرازی کا مذاق اپنے اندر پرورش کرنا اور نہ یہود کی شہ سے فتنہ جوئی کی اس بیماری میں مبتلا ہونا ورنہ یاد رکھو کہ پرائے شگون پر تم اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد کیف تکفرون سے پھر وہ دعوت سامنے آگئی ہے جو اعبدوا ربکم سے شروع ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد قیامت کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس پہلو سے کہ جس خدا نے تمہیں عدم سے وجود بخشا وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ آخر کیوں نہیں پیدا کر سکتا؟ دوسری ربوبیت کے پہلو سے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ پورا سلسلہ کلام اوپر سے بھی مربوط ہے اور اس کی ہر کڑی باہم بھی ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہے۔ پہلے خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور اس کے ساتھ توحید کا بیان ہے کیونکہ خدا کی بندگی بغیر توحید کے بے معنی ہے۔ اس کے بعد رسالت پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس کی دلیل کے طور پر قرآن حکیم کے معجزے کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر انکار کی سزا اور ایمان کی جزا بیان ہوئی ہے۔ پھر بر سبیل تنبیہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جزا اور سزا کا جو بیان بطور تمثیل ہوا ہے یہود کی پیروی میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش میں نہ لگ جانا۔ پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس دعوت کے پہلے ہی لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان کے مدعی ہوں لیکن وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن مانتے ہوں وہ درحقیقت خدا کے ماننے والے نہیں بلکہ اس کے منکر ہیں۔ (باقی آئندہ)

تفسیر احسن التفاسیر
از: سید احمد حسن محدث دہلوی
آسان اور عام فہم انداز میں ایک انوکھی تفسیر۔
ہدیہ منزل اول صرف دس روپے
ملنے کا پتہ: المکتبۃ الرحمانیہ اچھرہ لاہور

اسلامی قانون

امین احسن اصلاحی

اسلامی قانون کی تدوین

(۲)

تدوین قانون کے چند اصول

اس ملک میں اگر قانون اسلامی کی تدوین کے کام کو صحیح طور پر انجام دینا ہے اور یہ چیز بھی پیش نظر ہے کہ یہ قانون نافذ ہو کر کامیاب بھی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پچھلے تجربات سے فایدہ اٹھائیں اور ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں جن کے مضر نتائج کا تجربہ ہو چکا ہے۔ پاکستان کے حالات کے لحاظ سے میں یہاں تدوین قانون کے سلسلے میں جو باتیں ضروری سمجھتا ہوں ان کو بالاجمال عرض کرتا ہوں۔

میرے نزدیک تدوین قانون کے کام کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام ضروری ہے۔

اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں میں رواداری

پہلی چیز یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں میں رواداری کی اسپرٹ پیدا ہو۔ لوگ حنفی اور اہل حدیث، مالکی اور شافعی کی اصطلاحات میں بات کرنا چھوڑ دیں۔ فقہ خواہ امام ابوحنیفہؒ کی ہو یا امام مالکؒ کی، امام شافعیؒ کی ہو یا امام احمد بن حنبلؒ کی، سب ہماری اپنی ہی فقہیں ہیں۔ ان سب کی بنیاد کتاب و سنت اور اجتہاد کے صحیح اصولوں پر ہے۔ اور یہ سب ہمارا مشترک سرمایہ ہیں۔ چاروں ائمہ بھی ہمارے مشترک امام ہیں۔ ان میں سے کسی کے خلاف یا کسی کے حق میں بیجا تعصب میں ہمیں نہیں مبتلا ہونا چاہیے۔ ہمیں قانون کی تدوین میں ان تمام فقہوں سے بغیر کسی فرق و امتیاز کے مدد لینی چاہیے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ مختلف مسایل میں جس کا اجتہاد بھی ہمیں کتاب و سنت کے زیادہ موافق اور

حالات اور مصالح سے زیادہ ہم آہنگ نظر آئے ہمیں وہ اختیار کر لینا چاہیے خواہ وہ کسی امام کی طرف بھی منسوب ہو۔ معقولیت کا تقاضا بھی یہی ہے اور اسلام نے ہمیں تاکید بھی اسی چیز کی ہے اجتہادی معاملات میں اسلام نے ہمیں امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ کی پیروی کی ہدایت نہیں کی ہے بلکہ اس اجتہاد کی پیروی کی ہدایت کی ہے جو کتاب و سنت سے زیادہ موافقت رکھنے والا نظر آئے۔ اسی چیز کی تاکید ان بزرگ ائمہ نے بھی فرمائی ہے۔ اگر ہم تدوین قانون کے معاملہ میں یہ روش اختیار کریں گے تو اس سے کئی نہایت واضح فائدے ہوں گے۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہمارا قانون کسی متعین فقہ پر مبنی ہونے کے بجائے براہ راست اسلامی قانون کے مآخذ پر مبنی ہوگا اور ہم اس کو صحیح معنوں میں اسلام کے قانون سے تعبیر کر سکیں گے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس قانون پر اس ملک کے تمام مسلمان فرقوں کو اعتماد ہوگا، اس کے خلاف کسی فرقہ کے اندر تعصب یا بدگمانی کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہے گی کیونکہ اس کی بنیاد براہ راست ان چیزوں پر ہوگی جو بلا استثنا تمام مسلمانوں کے درمیان مشترک ہیں۔ اس کا تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم ایک ایسا ضابطۂ قانون مدون کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو موجودہ زمانہ کے تمام تقاضوں کو بہتر سے بہتر طریقہ پر پورا کر سکے گا۔ کیونکہ ہماری اسلامی فقہ بحیثیت مجموعی بہتر سے بہتر قانونی مواد پر مشتمل ہے۔ اس کا چوتھا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنے معاشرہ اور اپنے نظام زندگی کو فرقہ وارانہ تعصبات کی ان بہت سی خرابیوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہمارے اندر چوتھی صدی ہجری کے بعد پھیلی ہیں، اس سے پہلے ہمارا معاشرہ ان چیزوں سے بالکل پاک تھا۔

میری اس بات سے کسی کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ میں ایک ایسے ملک میں جس میں حنفی فقہ کے پیروؤں کی بھاری اکثریت ہے، اکثریت کے قانون کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ میں اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں اگر ہم حنفی فقہ کو وہ اہمیت نہ دیں گے جس کی وہ فی الواقع مستحق ہے تو یہ ایک دوسری خرابی ہوگی جو ہم اپنے کام میں پیدا کریں گے۔ اکثریت کی فقہ کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو اس ملک کا قانون اکثریت کی نگاہوں میں وہ احترام نہ حاصل کر سکے گا جو احترام اس قانون کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ قانون کی تدوین کے وقت دوسری فقہوں کو بھی نظر انداز

نہ کیا جائے بلکہ باہمی موازنہ و مقابلہ کے بعد جو مسلک دلائل کی کسوٹی پر زیادہ کھرا ثابت ہو اس کو اختیار کیا جائے۔ اور اس کام کو گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر کیا جائے۔

کتاب و سنت کی تعبیر میں سلف صالحین کی پیروی

دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ تدوینِ قانون کے کام کے ہر مرحلہ میں یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے کہ مسلمان کتاب و سنت کی جن تعبیروں پر اعتماد رکھتے ہیں انہی تعبیروں پر مبنی ضابطہ قانون بنایا جائے۔ اگر اپنی طرف سے نئی تعبیریں محض شوقِ اجتہاد میں پیش کرنے کی کوشش کی گئیں تو ان کو لوگ ہرگز قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے اور اگر غلط طریقوں سے ان کو لوگوں پر لادنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج مضر بلکہ مہلک ہوں گے۔ کسی چیز کی نئی تعبیر پیش کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن اس کے لیے اہلیت و صلاحیت شرط ہے جو کام امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما جیسے جلیل القدر لوگوں نے انجام دیا ہے وہ کام اگر نااہل لوگ سنبھال لیں گے تو مسلمان اس پر کس طرح اعتماد کریں گے؟ بالخصوص اس صورت میں جب کہ ان کا کام ان بزرگ اماموں کے کام کے بالکل برعکس ہو۔ ائمہ کے کاموں پر ہر شخص کو جو اعتماد و اعتقاد ہے وہ محض قدامت پرستی اور اندھی تقلید کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کے مضمرات کی تعبیر و توجیہ کے لیے اور ان کے مقتضی اور اشارات کی روشنی میں اجتہاد کے لیے جو علم ان کے پاس تھا اس کی شہادت ان کے عظیم کارناموں سے ملتی ہے۔ یہ شہادت آج ان لوگوں کے پاس ہرگز موجود نہیں ہے جو لوگ ان کے اجتہادات کے مقابل میں اپنے اجتہادات پیش کرنے کے خواہش مند ہیں۔

پھر اس سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ سیرت و کردار کا ہے۔ ان بزرگ اماموں پر اپنے دین کے معاملہ میں مسلمانوں کو جو بھروسہ ہے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان ائمہ نے دین کو امراء و سلاطین کی دستبرد اور دنیا پرست علماء کی حیلہ بازیوں سے بچانے کے لیے ایسی شاندار قربانیاں دی ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی تعبیرات اور ان کے اجتہادات کے مقابل میں ان لوگوں کی تعبیرات و اجتہادات پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے جن کے بارہ میں ہر شخص کو علم ہے کہ دین سے زیادہ ارزاں اور حقیر شے ان کی نگاہوں میں اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

اس وجہ سے سلامتی کا راستہ ہمارے نزدیک یہی ہے کہ کتاب و سنت کی تعبیرات میں سلف صالحین کی پیروی کی جائے۔ علیٰ ہذا القیاس جن معاملات میں ائمہ کے اجتہادات موجود ہیں ان میں ان کے

اجتہادات سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ انہی کی اختیار کردہ صورتوں میں سے جو صورت دلائل کی کسوٹی پر زیادہ بہتر ثابت ہو اختیار کر لی جائے۔

نئے مسائل جن کے بارہ میں ائمہ کے اجتہادات موجود نہیں ہیں

البتہ جن معاملات میں پچھلے ائمہ کے اجتہادات موجود نہیں ہیں ان میں بہتر شکل یہ ہوگی کہ مختلف مسلمان ملکوں کے ذی علم اور مستند علماء نے جو فتوے دیے ہیں یا جو رائیں ظاہر کی ہیں وہ سب جمع کرا لی جائیں اور ان میں سے جو رائے جس معاملہ میں دلائل کی روشنی میں زیادہ مضبوط نظر آئے وہ اختیار کر لی جائے۔ ایسے بھی بہت سے مسائل ہیں جو پیدا تو ہو چکے ہیں لیکن ان پر شرعی نقطہ نظر سے یا تو ابھی غور ہی نہیں کیا گیا ہے یا غور کیا گیا ہے تو کافی نہیں غور کیا گیا ہے۔ اس طرح کے مسائل پر غور و بحث کے لیے ضروری مواد فراہم کیا جائے اور پھر ذی صلاحیت افراد مقرر کیے جائیں جو پوری تحقیق اور پورے مطالعہ کے بعد اپنے نتائج تحقیق پیش کریں تاکہ تدوین قانون کے کام میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

عرف اور مصلحت پر مبنی احکام میں مناسب حال تبدیلی

جو احکام رواج یا مصلحت پر مبنی ہیں ان کے بارہ میں میں اپنے ایک لکچر میں عرض کر چکا ہوں کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اسلامی قانون کا یہی دائرہ ہے جو تغیر پذیر ہے۔ اور اس کے تغیر پذیر ہونے میں بڑی برکت ہے۔ اس تغیر پذیری ہی سے اسلامی قانون میں وہ لچک پیدا ہوتی ہے جس سے وہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سازگاری پیدا کرتا ہے۔ اسلامی قانون کے دوسرے دائروں میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کرنا جس طرح بہت بڑا گناہ ہے اسی طرح اس دائرہ میں جمود پیدا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہماری فقہ میں جو مسائل ایسے ہیں جو عرف و مصلحت پر مبنی ہیں ہم اپنے قانون میں ان کو انہی صورتوں میں اپنانے کی کوشش نہ کریں بلکہ حالات اور مصالح کے تغیر کے لحاظ سے چاہیے کہ ان میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں۔

قانونِ اسلامی کے نفاذ کے لیے ضروری تیاری

اگر اس ملک میں اسلامی قانون کا نفاذ مدنظر ہو تو یہ کام دفعۃً نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے زمین

تیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس تیاری کے لیے جو باتیں ضروری ہیں، میں مختصر طور پر ان کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔

نظام تعلیم کی اصلاح اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کی اصلاح کی اس لیے ضرورت ہے کہ اسلامی قانون جن تصورِ حیات اور جن عقائد و نظریات پر مبنی ہے ہمارا موجودہ نظام تعلیم اس سے بالکل مختلف تصورِ حیات اور بالکل متضاد عقاید و نظریات پر مبنی ہے۔ اس تصورِ حیات اور ان عقاید و نظریات کے ساتھ اسلامی قانون کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ جن عقاید و نظریات کی تعلیم ہمارے کالجوں اور ہماری یونیورسٹیوں میں دی جارہی ہے اگر انہی کے اوپر ہم اسلامی قانون کا پیوند لگانے کی کوشش کریں گے تو اسلامی قانون کبھی پروان نہ چڑھ سکے گا بلکہ بہت جلد وہ اس زمین اور اس آب و ہوا کو ناسازگار پاکر خشک ہوجائے گا۔ اسلامی قانون کی کامیابی کے لیے پہلی چیز ذہنوں کی تیاری ہے۔ یہ قانون جب اہل عرب کو دیا گیا ہے تو اس سے پہلے ایک طویل عرصہ تک ان کے ذہنوں اور دماغوں کو صاف کیا گیا اور زندگی کے متعلق ان کے تصورات و نظریات درست کیے گئے۔ جب ان کے نظریات درست ہوگئے، تو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو یہ قانون دیا گیا اور انھوں نے اس کو اس طرح قبول کیا جس طرح ایک بھوکا غذا کو یا ایک پیاسا پانی کو قبول کرتا ہے۔ اگر اس ذہنی تزکیہ کے بغیر کسی مصنوعی طریقہ سے اس قانون کو ان پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی تو طبیعتیں اس کے خلاف بغاوت کرتیں۔ اول تو اس کو اپنے اوپر غالب ہی نہ ہونے دیتیں اور اگر یہ کسی طرح غالب ہوجاتا تو وہ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ذرا گنتی۔

پرانے نظام تعلیم کی اصلاح جس طرح ہمارا جدید نظام تعلیم اسلام اور اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے بالکل غلط چل رہا ہے۔ اسی طرح بدقسمتی سے ہمارا پرانا نظام تعلیم بھی اسلامی قانون کے نفاذ کے مقصد کو کچھ تقویت پہنچانے والا نہیں ہے بلکہ اس کو کچھ نقصان ہی پہنچانے والا ہے۔ یہ نظام تعلیم اگرچہ حالات کی انتہائی ناموافقت کے باوجود مذہب ہی کی خدمت کے لیے قائم رہا ہے لیکن ایک عرصہ دراز سے اس کے اندر ایسی خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں جن کی موجودگی میں وہ مفید کم اور مضر زیادہ ہے۔ اس کی عام خرابیوں سے مجھے اس وقت بحث کرنے کا موقع نہیں ہے، میں صرف اس خرابی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں

ایک بڑی رکاوٹ آج بھی ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوئی تو آئندہ یہ اپنی موجودہ صورت سے بھی زیادہ پیچیدہ صورت میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

وہ خرابی یہ ہے کہ عام طور پر ہمارے ہمارے دینی مدرسوں میں فقہ کی تعلیم تقلید کے اصول پر دی جاتی ہے جو مدارس حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہ صرف حنفی فقہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو مدرسے اہل حدیث کے ہیں وہ صرف اہل حدیث کی فقہ پڑھاتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک میں اہل سنت کے یہی دو مکتب فکر موجود ہیں لیکن دونوں ہی اپنے اپنے طریقوں میں نہایت متشدد ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہے کہ صرف اپنے مخصوص مکتب فکر کی فقہ کو لے کر بیٹھ جانے کے بجائے پوری اسلامی فقہ کو اپنی فقہ سمجھے اور فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر ہو کر محض دلیل کی قوت کی بنا پر ایک چیز کو ماننے اور محض دلیل ہی کی کسوٹی پر پرکھ کر ایک چیز کو رد کر دے۔ قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کسی چیز کے رد و قبول کے معاملہ میں تقلید جامد کے نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرسکتا ایک بڑی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون کو حکومت کا قانون بنانے کے لیے لوگوں کے اندر رواداری کی روح اور فکر و نظر کی آزادی پیدا ہونا ضروری ہے۔ اگر ہمیں اس ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کا مقصد عزیز ہے تو ہمیں اس خرابی کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اور اس کی اصلاح کا واحد طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے علماء حنفی اور اہل حدیث کی اصطلاحوں میں بات کرنے کے بجائے صرف قرآن و حدیث کی اصطلاحوں میں بات کریں اور اپنے مدارس میں متعین فقہوں کی تعلیم دینے کے بجائے پوری فقہ اسلامی کی تعلیم دیں تاکہ طلبہ کے ذہنوں میں وسعت اور رواداری پیدا ہو۔ اگر یہ چیز نہ پیدا ہوسکی تو اول تو اس ملک کے اندر صحیح قسم کا اسلامی قانون نافذ ہی نہ ہو سکے گا اور اگر بالفرض نافذ ہو بھی گیا تو وہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گا۔ آج جو لوگ اسلامی قانون کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت کے لیے سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہمارے مذہبی گروہوں کی یہی فرقہ وارانہ ذہنیت فراہم کررہی ہے۔

مغربی اثرات کی بیخ کنی ہمارے ملک میں انگریز اپنے طویل دور اقتدار کے جو اثرات ہمارے ذہنوں کے اندر اور ہماری تہذیب و معاشرت کے اوپر چھوڑ گئے ہیں وہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی بدستور قائم ہیں۔ یہ اثرات اگر اسی طرح باقی رہیں تو ان میں اور اسلامی قانون میں قدم قدم

پر تصادم ہوگا اور اس تصادم میں اسلامی قانون ایک طرف ہوگا اور وہ قوم جس کو ہم اسلامی قانون کا مطالبہ کرنے والی سمجھتے ہیں دوسری طرف ہوگی۔ انگریزی اقتدار کے زیر اثر شراب، جوا رقص و سرود، بے حیائی و بے پردگی، ریڈیو، سینما اور زناکاری کی جو چاٹ لگ چکی ہے اس کو مجرد قانون سے نہیں روکا جا سکتا بلکہ ان چیزوں کے مقابل میں اگر تنہا قانون آئے گا تو میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ ان چیزوں کے مقابل میں قانون سے پہلے پروپیگنڈے کی طاقت کو آنا چاہیے اور یہ طاقت اتنی زبردست ہونی چاہئے کہ ان چیزوں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں اتنی شدید نفرت پیدا ہوجائے کہ لوگ ان کے خلاف قانون بنانے کے لیے قانون سازوں کو مجبور کردیں اور جب ان کے خلاف قانون بن کر آئے تو اس کا اس طرح خیر مقدم کریں جس طرح مسلمانوں نے کسی زمانہ میں ان برائیوں کے خلاف قوانین کا خیر مقدم کیا تھا۔

یہ کام مؤثر طریقہ پر ملک کی حکومت اور اصلاحی جماعتوں کے باہمی تعاون ہی سے ہو سکتا ہے۔ اگر یہ دونوں طاقتیں مل کر اس کام کو کریں تو نہایت قلیل عرصہ میں تمام خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس تعاون کے بغیر ان خرابیوں کا دور ہونا ناممکن ہے۔

اسلامی قانون کے خلاف شبہات کا ازالہ

ان چیزوں کے علاوہ ایک نہایت قابل توجہ چیز یہ بھی ہے کہ ایک مدت دراز سے اسلام اور اسلامی قانون پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے وہ بھی زیادہ تر معذرت خواہانہ قسم کا ہے۔ اس کے برعکس اس دوران میں دوسرے قوانین اور دوسرے نظاموں پر اتنا وسیع اور اتنا قیمتی کام ہوا ہے کہ ہمارے لیے اس کا صحیح صحیح اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ اس صورت حال نے قدرتی طور پر اسلامی قانون کی عزت و وقعت موجودہ زمانہ کے لوگوں کے ذہنوں میں بہت گھٹا دی ہے۔ لوگ اس کو فرسودہ قسم کی ایک چیز سمجھتے ہیں۔ اس کے متعلق جو شبہ یا اعتراض بھی پیدا ہوا ہے اس کو دور کرنے کی بہت کم کوشش ہوئی ہے اس وجہ سے اس نے موجودہ زمانہ کے لوگوں کے ذہنوں میں ایک عقیدہ کی طرح جڑ پکڑ لی ہے۔ ایسی کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں جو ان شبہات و اعتراضات کو دور کر کے لوگوں کو اسلامی قانون کا صحیح تصور دے سکیں۔ اس وجہ سے نہایت شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ (باقی صفحہ پر)

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

پاکستان اور اسلامی تنظیمات
سر سید احمد خاں مرحوم بحیثیت ایک لیڈر، مصلح اور نجات دہندہ
مجتہدین، اجتہاد اور اجماع

پچھلے دنوں امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب مجھ سے میرے مکان پر ملے تھے۔ وہ میرے پاس کچھ سوالات چھوڑ گئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان سوالوں کے جواب بھی فرصت میں قلم بند کروں۔ مشرق وسطیٰ کی اسلامی تحریکات پر شاید وہ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں جس کے لیے ان کو ان سوالوں کے جواب کی ضرورت ہے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد میں نے ان ..... کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان میں بعض سوالات تو علمی و مذہبی نوعیت کے ہیں اور زیادہ تر جماعت اسلامی اور اس سے میری علیحدگی کے مسئلہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ جو سوالات جماعت اسلامی اور اس سے میری علیحدگی سے تعلق رکھنے والے ہیں ان کے جوابات ان صفحات میں دینا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی اس وقت میدان عمل میں موجود نہیں ہے، میرا اس سے جو اختلاف تھا اس کی تنظیم سے بحیثیت ایک تنظیم کے تھا نہ کہ اس سے تعلق رکھنے والے افراد سے۔ اس وجہ سے یہ بات اب کچھ نامناسب سی ہوگی کہ میں ان صفحات میں جماعت کو زیر بحث لاؤں۔ رہے جماعت سے تعلق رکھنے والے افراد، تو

ان سے میری کوئی نزاع نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ وہ میرے موافق بھی ہو سکتے ہیں اور مخالف بھی، لیکن میں ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنے دل میں اچھے ہی جذبات رکھتا ہوں۔ ان کے اندر اب بھی میرے بہترین احباب ہیں جن کی دوستی کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا ایک اختلاف تو وہ تھا جس کا تعلق اُن اقدامات سے تھا جو جماعت کے دستور و آئین کے خلاف کیے گئے تھے اور دوسرا اختلاف وہ ہے جو بعض اشخاص کے نظریات سے ہے۔ میں پہلی قسم کے اختلافات کو (اور میرے یہی اختلافات جماعت سے براہ راست تعلق رکھنے والے ہیں) اپنی بعض تحریروں میں شروع ہی میں اجمال کے ساتھ بیان کر چکا ہوں اور یہ تحریریں اسی وقت پریس میں بھی آچکی ہیں۔ جو لوگ ان اختلافات کی نوعیت سمجھنا چاہتے ہیں وہ اخبارات سے ان کو حاصل کریں اور ان کا مطالعہ کریں۔ میں اب ان پرانے قصوں کو دوبارہ دہرانے کی کوئی خواہش اپنے اندر نہیں پا رہا ہوں۔ رہے وہ اختلافات جو بعض بزرگوں کے نظریات سے مجھے ہیں تو ان کو میں نے پوری وضاحت کے ساتھ میثاق کے صفحات میں بیان کر دیا ہے۔ جو لوگ ان اختلافات کو سمجھنا چاہیں وہ میثاق کے وہ مضامین پڑھ لیں جو حکمت عملی کے نظریہ کی تردید میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان مضامین کو مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان میں جن نظریات کی تردید کی گئی ہے ان کو براہ راست جماعت اسلامی کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ جماعت سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد ممکن ہے ان نظریات کے حامی ہوں لیکن اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ بہت سے افراد ان کے مخالف بھی ہوں۔ اس وجہ سے جو لوگ ان مسائل کو زیر بحث لانا چاہتے ہوں ان سے میری یہ گذارش ہے کہ وہ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو زیر بحث لائیں جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ورنہ وہ میرے ساتھ بھی ناانصافی کریں گے اور مرحوم جماعت کے ساتھ بھی۔ میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان بحثوں کا کوئی تعلق بھی جماعت اسلامی ہند سے نہیں ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے حالات و مسائل سے تقسیم کے بعد سے میں بالکل بے تعلق اور بے خبر ہوں۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ ان امور میں ہندوستان کی جماعت کے

ارکان کا کیا نقطۂ نظر ہے۔ وہاں کے بعض حضرات نے اس دوران میں میرے خلاف کچھ خامہ فرسائی ضرور شروع کی تھی لیکن یہ باور کرنا میرے لیے مشکل ہے کہ انھوں نے جماعت اسلامی ہند کی نمایندگی کی ہے .... اس وجہ سے میں نے اس طرح کے لوگوں کی باتوں کو لائق اعتنا نہیں خیال کیا۔

ان معروضات کے بعد میں پروفیسر صاحب موصوف کے ان سوالات کو لیتا ہوں جو خالص علمی و اسلامی نوعیت کے ہیں اور اپنے علم کے حد تک ان کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ یہ سوالات انگریزی میں ہیں۔ میں ان کا اردو ترجمہ یہاں دے رہا ہوں۔

پروفیسر صاحب دریافت فرماتے ہیں:-

(۱) قادیانیوں کے ماسوا پاکستان میں جماعت اسلامی واحد مضبوط تنظیم تھی جو مذہبی ہونے کی مدعی تھی۔ کیا انقلابی حکومت کے اس کو ختم کرنے سے پہلے ہی اس کا انتشار میں مبتلا ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس قسم کی مذہبی تنظیمات پاکستان میں قابل عمل نہیں ہیں؟

(۲) صدر ریاست (فیلڈ مارشل) ایوب خان نے حال میں سر سید احمد خاں کو ایک بہت بڑا لیڈر، مصلح اور مسلمانوں کا نجات دہندہ قرار دیا ہے، کیا آپ ان کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں؟

(۳) کیا مجتہد کا تصور آج بھی کوئی عملی قدر و قیمت رکھتا ہے؟ کیا اجتہاد اور اجماع اب بھی قرآن کے ماہرین اور فقہا ہی کے لیے مخصوص ہیں؟

ان سوالوں کے جواب بالترتیب ذیل میں عرض کرتا ہوں۔

پاکستان اور اسلامی تنظیمات

(۱) اس امر میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ جماعت اسلامی انقلابی حکومت کے کسی اقدام سے پہلے ہی انتشار کا شکار ہو چکی تھی لیکن اس کے انتشار کو اس بات کی دلیل بنا لینا صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کی مذہبی جماعتوں کا وجود پاکستان کے مزاج اور اس کے حالات کے خلاف ہے۔ کسی جماعت یا تنظیم میں انتشار پیدا ہو جانے کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہوا کرتی ہے کہ وہ جماعت یا تنظیم اپنے

ملک کے حالات اور تقاضوں کے لحاظ سے ناموزوں ہوتی ہے بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ ملک کے حالات اور اس کی خصوصیات کے لحاظ سے تو وہ سب سے زیادہ موزوں اور قابلِ عمل تنظیم ہو لیکن بعض دوسرے اسباب سے اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی انتشار کا شکار ہو جائے۔ مثلاً۔

- یہ کہ جن صلاحیتوں کی قیادت اس کو پروان چڑھانے اور اس کو اس کے مقصد سے ہم کنار کرنے کے لیے مطلوب تھی اُن صلاحیتوں کی قیادت اس کو نہ حاصل ہو سکی ہو۔
- یہ کہ اس تنظیم کے لیے جو اصول بنائے گئے ہوں ان میں صحیح اصولوں کے ساتھ غلط فہمی کے سبب سے کچھ غلط اصول بھی ملا دیے گئے ہوں۔
- یہ کہ اصول تو فی نفسہٖ سب صحیح ہوں لیکن ذمہ داروں نے پوری وفاداری کے ساتھ ان اصولوں پر عمل کرنے اور عمل کرانے میں کوتاہی کی ہو۔
- یہ کہ اس تنظیم کو اس کی غایت تک پہنچانے کے لیے جو تدریج اور جو ترتیب مطلوب تھی کارفرماؤں نے اپنی بے صبری اور جلد بازی کے سبب سے اس کو نظر انداز کر دیا ہو اور اس کی بیچ کی سیڑھیوں کو چھوڑ کر اس کی آخری منزل پر پہنچ جانے کے لیے زقند لگا دی ہو۔
- یہ کہ اس تنظیم کی کامیابی کے لیے جو اخلاقی صفات درکار تھیں آگے چلنے والوں نے نہ تو ان کو اپنے ہی اندر پیدا کرنے کی کوشش کی ہو اور نہ اپنے پیچھے چلنے والوں ہی کی ان کے لیے تربیت کی ہو۔

یہ اور اسی طرح کی دوسری بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں جو کسی تنظیم کو باوجود اس کے کہ وہ اپنے ماحول کی فطرت اور خصوصیات کے بالکل مطابق ہو، انتشار میں مبتلا کر دے سکتی ہیں۔ اب یہ تجزیہ کرنے والے مورخ اور نقاد کا کام ہے کہ وہ سارے حالات کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرنے کے بعد بتائے کہ زیر بحث واقعہ میں کیا صورت پیش آئی ہے۔ میں تو صرف اصولی طور پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مذہبی تنظیم پاکستان میں ناکام ہو گئی تو لازمی طور پر یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ پاکستان کا مزاج مذہبی طرز کی تنظیمات کے خلاف ہے۔

پاکستان کے متعلق میرا ناچیز خیال تو یہ ہے کہ جتنا سازگار اس کا مزاج مذہبی تنظیمات کے لیے ہے اتنا سازگار یہ غیر مذہبی تنظیمات کے لیے نہیں ہے۔ اس ملک میں انگریزی طرز کی جمہوریت تو بلاشبہ ناکام ہو چکی ہے۔ اس امر میں ہم اپنے موجودہ لیڈروں کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ اس جمہوریت کا کئی سال تک اس ملک میں تجربہ ہو چکا ہے لیکن ہم محترم پروفیسر صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ اس ملک کی کسی مذہبی تنظیم کا انتشار میں مبتلا ہو جانا مذہبی تنظیمات کے لیے اس ملک کی ناموزونیت کی دلیل ہے۔

اس حقیقت کو ہر شخص جانتا ہے کہ کسی ملک کی فطرت سے سب سے زیادہ میل رکھنے والا طرزِ تنظیم وہی ہو سکتا ہے جو اس کے باطنی داعیات سے بالکل ہم آہنگ ہو۔ پاکستان اس وقت تمام دُنیا میں تنہا وہ ملک ہے جس کو صرف مذہب کے تقاضوں نے وجود بخشا ہے۔ مذہب اس ملک کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ قومیت کے عوامل کا اگر جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے معروف عوامل یا تو یہاں سرے سے پائے ہی نہیں جاتے یا پائے جاتے ہیں تو نہایت ضعیف حالت میں۔ لیکن مذہب کا عامل یہاں اس قدر قوی اور زوردار ہے کہ اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک دوسرے سے اتنے دُور دُور واقع ہونے والے خطوں کو باہمدگر نہایت مضبوطی کے ساتھ جوڑ رکھا ہے۔

مذہب کے ساتھ پاکستان کی اسی گہری وابستگی کا یہ اثر رہا ہے کہ یہاں ابتدا سے لے کر آج تک کوئی جماعت بھی کسی مذہبی نعرہ کے بغیر پبلک کے سامنے نہ آ سکی۔ یہاں دہریے اور کمیونسٹ بھی اگر سامنے آتے ہیں تو خدا اور رسول کا واسطہ دیتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ یہاں کے ۹۰ فی صد باشندوں کا مذہب اسلام ہے۔ اس مذہب کا ان کو علم ہو یا نہ ہو لیکن وہ اس سے گہری محبت ضرور رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اسلام صرف ایک دھرم نہیں ہے بلکہ وہ پوری انسانی زندگی کی تنظیم ہے اور اس تنظیم کی برکتوں ہی سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھوں نے اس ملک کو قائم کیا ہے اور اس کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ ایسے حالات میں مذہبی تنظیمات سے بڑھ کر اور کون سی تنظیمات ہیں جو ان کے حال اور ان کے مزاج سے مناسبت رکھنے والی ہو سکتی ہیں۔

اسی وجہ سے ہمارا یہ صرف ایک خیال ہی نہیں بلکہ نہایت مضبوط عقیدہ ہے کہ اس ملک میں کامیاب اور طاقتور تنظیم وہی ہو سکے گی جو مذہب کے اصولوں پر مبنی ہوگی۔ لیکن اب آئندہ جو لوگ اس مقصد کے لیے کام کریں گے وہ اگر سلامتی کا راستہ اختیار کرنا چاہیں گے تو انھیں مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

۱۔ ایک یہ کہ اس مقصد کے لیے وہی لوگ آگے بڑھیں جو اپنے اقوال اور اپنے اعمال میں مطابقت

پیدا کر سکنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ گندم نمائی اور جو فروشی کا کاروبار عارضی طور پر تو چمکایا جا سکتا ہے لیکن یہ بڑی جلدی بیٹھ جایا کرتا ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ اسلام نے معاشرہ کی اصلاح و تنظیم سے متعلق جو اصول مقرر کیے ہیں ان کی سختی سے پابندی کی جائے۔ حصولِ اقتدار کی طمع میں پھنس کر بنیادوں کی تعمیر سے پہلے چھتوں کی تعمیر پر محنت اور سرمایہ برباد کرنے کی غلطی نہ کی جائے۔

۳۔ تیسری یہ کہ کمیت کے مقابل میں ہمیشہ کیفیت پر نظر رہے۔ گہرا علم اور مضبوط سیرت رکھنے والے مٹھی بھر افراد بے مغز اور بے کردار نعرہ بازوں کی ایک پوری بھیڑ پر بھاری ہوتے ہیں۔

۴۔ چوتھی یہ کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے، ہماری دین و دنیا کی سعادت اس بات میں ہے کہ یہ جس شکل میں ہم کو ملا ہے اسی شکل میں ہم اس کو دنیا کے سامنے پیش کریں اور اگر قائم و نافذ کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہو تو اسی شکل میں اس کو قائم کریں۔ ہمیں اپنی مزعوم مصلحتوں اور حکمتوں کے تحت اس میں کسی رد و بدل یا تراش خراش کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ ہر اسلامی تنظیم اپنے مقصد کی طرح اپنے طریقۂ کار میں بھی انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ کار کی پیروی کرتی ہے اس وجہ سے اس میں مقصد جس طرح نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ ہوتا ہے اسی طرح اس کے حصول کے وسایل و ذرائع بھی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ یہ تنظیم اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے کبھی گھٹیا قسم کے وسایل و ذرائع اختیار نہیں کرتی۔

اسی طرح تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کے سیاسی و اجتماعی نظام سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں بعض غلط فہمیاں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ آئندہ جن لوگوں کو اس مقصد کے لیے کام کرنے کی توفیق دے، ان کے لیے ہمارا یہ ناچیز مشورہ ہے کہ وہ اچھی طرح مطالعہ کر کے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بعد اس کام کا ارادہ کریں۔ ہم ان غلط فہمیوں میں سے بھی بعض کی طرف یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں۔

(۱) یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے کوئی جماعت بنائی جائے تو اس کو تمام وہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو احادیث میں الجماعۃ کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ الجماعۃ سے خروج بجز اس صورت کے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، ارتداد و بغاوت ہے

لیکن کسی دوسری جماعت کو جب تک وہ الجماعۃ کے مقام پر نہ پہنچ جائے یہ درجہ حاصل نہیں ہوتا کہ اگر کوئی شخص اس سے علیحدہ ہو جائے تو اس کا دین و ایمان ہی خطرے میں پڑ جائے۔

(۲) اسی طرح یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اسلام میں جو شوریٰ کا حکم ہے تو اس کی نوعیت بس یہ ہے کہ خلیفہ کی ایک مشاورتی کونسل ہو جس سے وہ وقتاً فوقتاً خاص خاص معاملات میں اپنے اطمینانِ قلب کے لیے مشورے لے لیا کرے، اس کے مشوروں کی پابندی خلیفہ یا امیر کے لیے ضروری نہیں ہے۔

(۳) اسی طرح یہ خیال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ کسی مذہبی تنظیم کے لیڈر یا امیر کے غلط اقدامات اور فیصلوں پر اگر کچھ لوگ آپس میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر دیں تو وہ اس نجویٰ کے حکم میں داخل ہے جس کو قرآن میں نفاق قرار دیا گیا ہے۔

(۴) علیٰ ہذا القیاس یہ خیال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصود حکومتِ الٰہیہ کی تحریک چلانا ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کی دعوت دینے کے لیے تشریف لائے۔ حکومتِ اسلامی کا قیام ایک آزاد اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

اس قسم کی غلط فہمیاں زیادہ تر یا تو اسلامی طریقۂ تنظیم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں یا پھر لیڈروں کے اندر غلط رجحانات پیدا ہو جانے کا ـــــ یہی چیزیں آگے چل کر خرابیوں کا باعث ہوتی ہیں۔ اگر اس قسم کی باتوں سے بچ کر صحیح ترتیب کے ساتھ بے لوث ہو کر کام کیا جائے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش سے پہلے لوگوں کے دلوں پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے قابلِ عمل اور بابرکت تنظیم وہی ہو سکتی ہے جو اسلام کے اصولوں پر قائم ہو۔

سر سیّد احمد خاں مرحوم بحیثیت ایک لیڈر، مصلح اور نجاتِ دہندہ

(۲) سر سیّد احمد خاں مرحوم کے جہاں تک ایک بہت بڑے لیڈر ہونے کا تعلق ہے، یہ ایک واقعہ اور ایک حقیقت ہے کہ وہ مسلمان قوم کے ایک بہت بڑے لیڈر تھے۔ انھوں نے تاریخ کے ایک نہایت ہی نازک دور میں مسلمانوں کی خدمت کی اور ایسے اخلاص کے ساتھ خدمت کی کہ اس اخلاص کی کم از کم اس پچھلے دور میں تو مثال ملنی مشکل ہے۔ یہ ان کے خلوص ہی کی برکت تھی

کہ نہایت اعلیٰ قابلیتوں اور نہایت بلند سیرت و کردار کے اتنے رجال وقت انھوں نے اپنے اردگرد جمع کر لیے کہ ان کے سوا ہمارے بڑے بڑے لیڈروں میں سے کوئی دوسرا شخص ان صفات اور صلاحیتوں کے اتنے اشخاص اپنے اردگرد جمع نہ کر سکا۔ شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک کس کس کو گنیے؛ ان میں سے ایک ایک شخص اپنے علم و فضل اور اپنی خدمات قومی کے لحاظ سے تمام مسلمانوں کے لیے قابل فخر ہے۔ ان سب لوگوں نے سرسید کا ساتھ دیا اور بڑی وفاداری کے ساتھ، ساتھ دیا۔ مولانا شبلیؒ کو ان کے بعض سیاسی نظریات سے اختلاف ہوا لیکن اس کے باوجود وہ اُن کے خلوص قومی کے اتنے قائل تھے کہ جب ان کی وفات کی خبر سُنی تو اپنے ایک خط میں انھوں نے اس حادثہ کو ایک عظیم قومی حادثہ قرار دیا۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سرسید مرحوم کی تفسیر قرآن کو ایک فتنہ سمجھتے تھے لیکن ان کے قومی خلوص اور ان کے کردار کی بلندی کے بڑے مداح تھے۔

بہرحال، ہم نے اگرچہ ان کو دیکھا نہیں لیکن نہایت اچھے لوگوں سے ان کی قومی دردمندی کی نہایت موثر حکایتیں سنی ہیں۔ اس وجہ سے ہم ان کو مسلمان قوم کا ایک بہت بڑا لیڈر مانتے ہیں، البتہ مصلح اور نجات دہندہ وغیرہ الفاظ کے استعمال میں میں بڑی احتیاط کرتا ہوں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم لوگوں کے نزدیک الگ الگ ہیں۔ میرے نزدیک ان اصطلاحات کے جو مفہوم معتبر ہیں ان کے لحاظ سے نجات دہندہ صرف اللہ تعالیٰ ہے اور مصلح میں صرف ان لوگوں کو سمجھتا ہوں جنھوں نے انبیاء کے طریقہ پر اس دنیا کی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہو۔

لیکن سرسید احمد خاں مرحوم کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ وہ مسلمان قوم کے صرف ایک قومی لیڈر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک متکلم بھی تھے .... ان کے زمانے میں انگریز مستشرقین اور انگریز پادریوں کی طرف سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر جو اعتراضات ہوئے انھوں نے ان کے جوابات بھی لکھے اور اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی۔ متکلمین اور مناظرین کے متعلق یہ بات ہر صاحب علم جانتا ہے کہ اس گروہ کو دین کے اصول و مبادی کا اہتمام اتنا نہیں ہوتا جتنا اہتمام انھیں مخالف و معترض کے سوال و جواب کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ نیک نیتی سے اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اگر اسلام پر کوئی اعتراض ان کے علم میں آئے تو اس کا کوئی ایسا جواب ضرور دیں جس سے معترض کو چپ کیا جا سکے، اگرچہ وہ جواب حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ

اس امر میں بھی کوئی خاص حرج نہیں سمجھتے کہ اگر اسلام کے خلاف کسی اعتراض کا جواب ان سے بن نہ آئے تو وہ اسلام کی اس بات کی الٹی سیدھی کوئی تاویل کر ڈالیں۔ ان کی اسی کمزوری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر دور کے متکلمین نے اسلام کو اپنے اپنے دور کی عقلیت کے معیار پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب یونانیوں کا فلسفہ مسلمانوں میں پھیلا تو کچھ لوگوں نے اسلام کو اس کے معیار پر پورا اتارنے کی کوشش کی، پھر جب مغرب کا نیا فلسفہ سامنے آیا تو کچھ لوگوں نے اس کی ترازو سے اسلام کو تولنا شروع کیا۔ اسلام کی خدمت و نصرت کا صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ ہر دور کی عقلیت کے مقابل میں اسلام کی اپنی عقلیت اجاگر کی جاتی لیکن غزالی کی معرفت، ابن تیمیہ کی بصیرت، شاہ ولی اللہ کی حکمت اور علامہ اقبال کی نظر ہر شخص کہاں سے لا سکتا ہے؟ سرسید مرحوم اس میدان میں علم معیار سے کوئی بلند خدمت کیا انجام دے سکتے تھے؟ کوئی بلند کام کرنے کے لیے جدید فلسفہ سے بھی گہری واقفیت کی ضرورت تھی اور اسلامی علوم میں بھی تبحر کی ضرورت تھی۔ جہاں تک مغربی فکر و فلسفہ کا تعلق ہے اس سے ان کی براہ راست کوئی واقفیت نہیں تھی بلکہ جو کچھ تھی محض سنی سنائی تھی۔ اسی طرح علم دین سے بھی ان کو براہ راست واسطہ بہت کم پیش آیا۔ بس یہ بات ضرور تھی کہ آدمی ذہین تھے اور مسلمانوں کی مدافعت کے لیے طبیعت میں غیرت و حمیت رکھتے تھے اس وجہ سے اہل مغرب کی جن باتوں کو انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض سمجھا اس کا جواب دینے کی ضرور کوشش کی لیکن اس جواب دینے میں ان کا عام طریقہ یہ تھا کہ وہ اہل مغرب کے فکر و فلسفہ اور انہی کے طور طریقہ کو اصل معیار قرار دے لیتے ہیں اور کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ اسلام کو اس معیار پر پورا اتار دیں۔ اگر اس میں کامیابی ہو جاتی ہے تو فبہا ورنہ اگر دیکھتے ہیں کہ کسی چیز کی تاویل میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے تو جرأت کر کے اسلام میں اس کے وجود ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔

میں سرسید مرحوم کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو الگ الگ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے تو میرے دل میں ان کے لیے بڑا احترام ہے لیکن ایک متکلم کی حیثیت سے میں ان کو ایک عام درجہ کا متکلم سمجھتا ہوں اور جب میں ان کی اس طرح کی چیزیں پڑھتا ہوں تو میرے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ یہ چیزیں نہ لکھتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس قسم کی لغزشوں اور بے احتیاطیوں کو معاف فرمائے۔

مجتہدین، اجتہاد اور اجماع

(۳) پروفیسر صاحب کے تیسرے سوال کے جواب میں گذارش ہے کہ اس میں شبہ نہیں ہے اسلام میں اجتہاد اور اجماع کے معاملات قانون اسلامی کے ماہرین اور مجتہدین ہی کے لیے خاص ہیں، لیکن اس تخصیص کی بنیاد کسی روایت پرستی، کسی طبقاتی یا خاندانی تقدیس یا کسی گروہ خاص کی اجارہ داری پر نہیں ہے بلکہ اسلامی قانون کے ایک فطری تقاضے پر ہے۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ اسلامی قانون عام دنیاوی قوانین کی طرح بادشاہوں، عدالتوں، پارلیمنٹوں اور قانون ساز مجلسوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کا دیا ہوا ہے۔ ہم اپنی طرف سے نہ اس میں کوئی ترمیم و تغیر کر سکتے اور نہ کوئی کمی بیشی۔ ہمیں اس قانون میں صرف اتنا اختیار ہے کہ جو حالات و مسائل ہمارے سامنے ایسے آئیں جن کی وضاحت اصل قانون میں نہیں ہے ان کے لیے، اصل قانون کو سامنے رکھ کر، اس کے اشارات اور تقاضوں کی روشنی میں، احکام و ہدایات مستنبط کر لیں۔ اسی استنباط کو اسلام کی اصطلاح میں اجتہاد کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ اجتہاد ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ یہ ایک طرف تو اس امر کا مقتضی ہے کہ آدمی کو اصل قانون میں پوری پوری مہارت حاصل ہو تاکہ وہ اس کے اشارات اور مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور زندگی کے مسائل پر ان کو منطبق کر سکے نیز دوسرے اس کے اخذ و استنباط پر اعتماد کر سکیں۔

دوسری طرف یہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ آدمی اصل قانون، کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان و اعتقاد رکھتا ہو۔ کیونکہ اس ایمان و اعتقاد کے بغیر اس کے اوپر یہ بھروسہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ پوری وفاداری اور دیانت کے ساتھ اس اجتہاد کے فرض کو انجام دے گا۔

اب غور فرمائیے کہ جس کام میں فنی اور قانونی مہارت و قابلیت کی ضرورت ہے اس میں ایک ایسے شخص کے دخل دینے کے کیا معنی جو نہ اصل قانون کی زبان اور اس کے قواعد سے واقف، نہ اس کے ماخذوں کے مراتب و مدارج سے واقف نہ اس کی ترمیمات اور تبدیلیوں سے واقف؟ اگر اسلام اجتہاد کرنے سے کسی ایسے شخص کو روکے جو ان صفات کا حامل ہے تب تو یہ بات بلاشبہ قابل اعتراض

ہے لیکن اس صورت میں یہ بات قابل اعتراض کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ اسلام ہر اس شخص کو اجتہاد کا حق دیتا ہے جو ان اوصاف کا حامل ہے، عام اس سے کہ وہ کوئی مرد ہے یا عورت، آزاد ہے یا غلام، عربی ہے یا عجمی۔ صرف ان کو اس چیز سے روکتا ہے جو ان صفات کے حامل نہیں ہیں اگرچہ عام معنی میں وہ علماء اور مولویوں ہی کے گروہ سے تعلق رکھنے والے کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح جب اس کے لیے ایمان و اعتقاد کی شرط ہے تو آخر اس قانون میں ان لوگوں کے اجتہاد کے کیا معنی جو سرے سے اس کو خدائی قانون مانتے ہی نہیں۔ ایسے لوگوں پر یہ اعتماد کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی حرمت اس طرح ملحوظ رکھ سکتے ہیں جس طرح خدائی قانون کی حرمت ملحوظ رکھنے کا حق ہے۔

اس قسم کی فنی اور قانونی قابلیت صرف اسلامی قانون ہی کی توضیح و تشریح میں ضروری نہیں سمجھی گئی ہے بلکہ یہ کام دنیا کے ہر قانون میں قانون اور اس کی اصل زبان کے ماہرین ہی کرتے ہیں۔ انگریزی اور امریکی قانون کی توضیح و تشریح اور معاملات زندگی پر ان کی تطبیق آخر انگلستان اور امریکہ کے علمائے قانون ہی کرتے ہیں، ان ملکوں کے عام افراد تو اس کام کے اہل نہیں سمجھے جاتے، پھر اجتہاد کے لیے اگر اسلام نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کام کو اسلامی قانون کے ماہر علماء ہی کریں تو اس پر لوگوں کو تعجب کیوں ہوتا ہے؟

اجتہاد ہی کی طرح اسلام میں اجماع کا معاملہ بھی ہے۔ جس طرح اجتہاد کا مفہوم عام معنی میں قانون سازی نہیں ہے بلکہ اسلام کے اصل قانون کے اشارات و مقتضیات کی روشنی میں مسائل و احکام کا اخذ و استنباط ہے اسی طرح اجماع کا مفہوم بھی مجرد مسلمانوں کا کسی امر پر متفق ہو جانا نہیں ہے بلکہ کسی بات پر اس پہلو سے متفق ہو جانا ہے کہ یہ بات اسلامی قانون کے نحوی اور مقتضی اور اس قانون کے امثال و نظائر کے مطابق ہے۔ انہی صفحات میں اسلام کے اصول قانون پر میرا جو طویل سلسلہ مضامین نکل رہا ہے اس میں تفصیل کے ساتھ میں نے یہ دکھایا ہے کہ اجماع درحقیقت اجتہاد ہی کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ ایک اجتہاد تو وہ ہوتا ہے جس کی حیثیت کسی مجتہد کی انفرادی رائے کی ہوتی ہے اور ایک اجتہاد وہ ہوتا ہے جس پر وقت کے تمام مجتہدین متفق ہو جاتے ہیں۔ اس ثانی الذکر نوعیت کے اجتہاد کو اسلام کی قانونی اصطلاح میں اجماع کہتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب اجماع کی بنیاد اجتہاد پر ہوئی تو اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ اس میں اصلی اعتبار مجتہدین اور ملت کے ارباب حل وعقد کا ہو نہ کہ عوام کا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں عوام کی شرکت کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ وہ اجماع اسلام میں معتبر نہیں ہے جس سے مجتہدین یعنی قانون اسلامی کے ماہرین الگ ہوں۔ اور غور کیجیے تو صاف واضح ہو جائے گا کہ جب اجماع کا مفہوم مجرد کسی امر پر جمہور کا اتفاق رائے نہیں ہے بلکہ ایک اجتہاد پر اتفاق رائے ہے تو اس اتفاق رائے سے مجتہدین، علماء اور ماہرین قرآن کے الگ کر لینے کے بعد اسلام کی نظر میں اس کی کیا قدر وقیمت باقی رہ جائے گی۔

اب رہا اس زمانہ میں مجتہد کے تصور کی عملی قدر وقیمت کا سوال تو اس کی قدر وقیمت کا انحصار اسلامی قانون کی قدر وقیمت پر ہے۔ دنیا کے جس خطہ کے مسلمان اسلامی قانون کی قدر وقیمت سمجھیں گے اور اس کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کریں گے ان کے لیے مجتہدین کی ضرورت ان کی اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہوگی جس طرح دنیا کے ہر نظام سیاسی میں ماہرین قانون اس نظام سیاسی کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں بعینہ وہی حیثیت اسلام کے نظام سیاسی میں مجتہدین رکھتے ہیں۔ ہاں اگر اسلامی قانون کی محض زبان سے قصیدہ خوانی ہوتی رہی، عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق قائم نہ ہو سکا تو خدا اور رسول کے تصور کی بھی اس زمانہ میں کوئی عملی قدر وقیمت باقی نہیں رہ جاتی مجتہد کے تصور کی عملی قدر وقیمت کا سوال تو بہت بعد کا سوال ہے۔

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر ومحراب! اقبال

المنبر

• بین الاسلامی اتحاد کا داعی • دعوت الی اللہ کا نقیب
• اثر انگیز مقالات کا مرقع [زیر ادارت: عبدالرحیم اشرف
۲۰×۳۰/۴ سائز، بیس صفحات، جاذب نظر سرورق۔
سالانہ چندہ، چھ روپے ششماہی، تین روپے
فی پرچہ، چار آنے [بھارت میں چندہ الفرقان لکھنؤ کو بھیجا جائے۔
نمونہ کیلئے ٹکٹ ارسال کیجئے
(ہندوستان ایڈیشن)
مینجر المنبر، ماڈل ٹاؤن بی، لائل پور پاکستان

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

سعودی حکومت کی بعض خدمات

سعودی حکومت کی چند خدمات بڑی قابل قدر ہیں۔ میں ان میں سے بعض کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سعودی حکومت کی سب سے زیادہ نمایاں خدمت حرمین شریفین کی توسیع وتجدید ہے۔ مسجد نبوی اور حرم مکہ کی تعمیر وتوسیع میں، اپنے زمانہ میں، ترکوں نے بھی بڑے نمایاں کام کیے تھے، لیکن سعودی حکومت نے اپنے دور میں جو خدمات انجام دی ہیں اور جو انجام دے رہی ہے اگر وہ پیش نظر اسکیم کے مطابق تکمیل کو پہنچ گئیں، تو ان کے سامنے نہ صرف تمام پچھلی خدمات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جائے گی بلکہ مستقبل کی تاریخ میں بھی یہ خدمات شاید ایک مدت دراز تک بے مثال ہی رہیں گی۔ مسجد نبوی تو سلطان ابن سعود مرحوم کے عہد حکومت ہی میں تکمیل کو پہنچ گئی تھی لیکن حرم مکہ کی توسیع وتعمیر کا کام ابھی جاری ہے اور کام کے نقشہ کی وسعت وعظمت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی یہ عرصہ تک جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سعودی حکومت کے ان منصوبوں کو تکمیل تک پہنچائے۔

اگرچہ ان گھروں کی رونق وعظمت مرمری ستونوں اور تعمیری گل کاریوں کی محتاج نہیں ہے لیکن معلوم نہیں کیوں ہر مسلمان کا دل چاہتا یہی ہے کہ حرمین کی عمارتیں ایسی شاندار ہوں کہ کسی عمارت کی شان بھی ان کی شان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کہیں پڑھا ہے کہ وہ حرم کے پاس کوئی مکان حرم سے اونچا نہیں بنانے دیتے تھے، لیکن بعد کے زمانوں میں عین حرم کی دیواروں سے متصل اہل مکہ نے کرایہ پر چلانے کے لیے فلک بوس عمارتیں بنالی تھیں اور ستم یہ کہ ان مکانوں کی کھڑکیاں حرم کی چھتوں پر کھلتی تھیں۔ سعودی حکومت نے ان تمام عمارتوں کا سر غرور اس طرح نیچا کر دیا کہ ان کو ڈھا کر توسیع حرم

کی اسکیم میں شامل کردیا اور خود حرم کی عمارت اتنی شاندار، اتنی خوبصورت، اور اتنی پُرعظمت بنوادی ہے کہ اس کے آگے اب کسی عمارت کے لیے سر اونچا کرنے کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہ گیا۔ میں عام طور پر بہت اونچی عمارتوں کے لیے اپنے دل کے اندر کوئی اچھا تاثر نہیں رکھتا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں حرم کی عمارت کے معاملے میں میرے جذبات بھی یہی ہیں کہ اس کے سامنے کسی عمارت کا سر اونچا نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ سعودی حکومت کو جزائے خیر دے کہ اس نے اس امکان کے تمام راستے بند کردیئے۔

۲۔ دوسری قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ سعودی عرب میں قانون کا رعب و دبدبہ بہت ہے۔ وہاں چوری ڈکیتی، رہزنی، قتل، زنا وغیرہ کی وارداتیں یا تو ہوتی ہی نہیں ہیں یا اس قدر کم ہوتی ہیں کہ نہ ہونے کے برابر۔ ملک اپنی آب و ہوا کے اعتبار سے اس طرح کے جرائم کے لیے جیسی سازگار فضا رکھتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے اس ملک کی اگلی اور پچھلی تاریخ میں کافی مواد موجود ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ قانون کے دبدبہ نے معلوم ہوتا ہے ملک کی آب و ہوا کا مزاج ہی بالکل بدل ڈالا ہے۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں حجاج اپنے روپے بے احتیاطی کے ساتھ لیے ہوئے سڑکوں پر یا حرم میں سو جاتے ہیں لیکن چوری اور جیب تراشی کے حوادث سے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ اس قسم کے حوادث کی اگر ایک دو اطلاعات ہمارے علم میں آئیں بھی تو معلوم ہوا کہ یہ آفاقی حضرات کے کارنامے ہیں، خاص سعودی حکومت کے باشندے ان معاملات میں بڑے محتاط ہوگئے ہیں۔

ہمارے زمانۂ قیام میں صرف ایک چور پر قطع ید کی سزا جاری ہوئی۔ اس کا ہاتھ کلائی کے پاس سے کاٹ کر باب ابراہیم کے سامنے لٹکایا گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے اس بات سے تو بڑی خوشی ہوئی کہ الحمدللہ اس کرۂ ارضی پر ایک حکومت ایسی موجود ہے جو اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا قانون جاری کرتی ہے لیکن ساتھ ہی میں اس سوچ میں بھی پڑ گیا کہ اسلام کے ان قوانین کو جاری کرنے کے لیے ملک کی معاشی اور اخلاقی فضا جیسی کچھ بنانی چاہیے اس کے بنانے کے لیے بھی سعودی حکومت نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہیں یا نہیں؟ یہ سوال اس دوران میں بار بار میرے ذہن میں اٹھتا رہا اور میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب

میں نہ پا سکا۔

بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات اس طرح کی سزاؤں کو "وحشیانہ" کہتے ہیں۔ جو لوگ ان سزاؤں کو "وحشیانہ" کہتے ہیں وہ ان تمام وحشیانہ حرکتوں کو بھول جاتے ہیں جن کا ارتکاب ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں ہزاروں کی تعداد میں ہو رہا ہے محض اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے ہمارے ہاں کے چور محفوظ ہیں۔ وہاں ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور حاجی حضرات جن کو اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہیں رہتا جہاں چاہتے ہیں اپنی نقدی کے تھیلے اور بٹوے لیے ہوئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں بھی اس کا کوئی امکان ہے؟ ہم آئے دن اپنے ملک کے اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ آج فلاں جگہ چوروں نے فلاں گھر پر حملہ کیا اور تمام گھر والوں کو، عورتوں اور بچوں سمیت قتل کردیا، یا ان کو آگ میں جلا دیا، یا ان کو زہریلی چیزیں کھلا کر بے ہوش کردیا، یا مردوں کو قتل کردیا، بچوں کو پیٹا اور عورتوں کی بے عزتی کی۔ یہ ساری چیزیں ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں اور ہمیں وحشیانہ نہیں معلوم ہوتیں لیکن اگر ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے تو ہمیں یہ سزا وحشیانہ معلوم ہوتی ہے۔ سوچنے کا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی کو چوروں، ظالموں، قاتلوں اور خونخواروں سے تو اس حد تک ہمدردی ہو کہ ان کا ہاتھ کاٹا جانا اسے گوارا نہ ہو لیکن ان کے ہاتھوں ہر روز ہزاروں بے گناہوں کا نہایت وحشیانہ طور پر مشقِ ستم بننا وہ گوارا کرے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ تعلیم و تہذیب کی کوئی ترقی بھی اس طرح کے حوادث کا سدباب کر سکتی ہے۔ اگر تعلیم و تہذیب کی ترقی ان چیزوں کا سدباب کر سکتی تو امریکہ اور انگلستان میں ان چیزوں کا سدباب ہو جانا چاہیے تھا لیکن آپ اخباروں سے معلوم کر سکتے ہیں کہ جس قسم کی سنگدلانہ چوریاں اور ڈکیتیاں انگلستان اور امریکہ کے مہذب ملکوں میں ہوتی ہیں اس قسم کی سنگدلانہ چوریاں اور ڈکیتیاں ہمارے ملکوں میں بھی نہیں ہوتیں۔

۳۔ تیسری قابلِ ذکر چیز تعلیم کی توسیع ہے۔ حجاز میں تعلیم کا اوسط بہت کم تھا، لیکن ادھر چند سالوں کے اندر حکومت نے مکاتب و مدارس کے قیام کی طرف بہت توجہ کی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ شہروں اور قصبات سے گذر کر اب دیہاتوں اور بدوی قبائل تک میں مکاتب کا جال بچھا دیا گیا ہے۔

اور خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ حکومت ان مدارس پر بڑی فیاضی کے ساتھ روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ بعض لوگوں نے تو مجھ سے یہاں تک کہا کہ حجاز میں مکاتب و مدارس کے طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو وظائف حکومت کی طرف سے ملتے ہیں ان کی مقدار اس تنخواہ سے زیادہ ہوتی ہے جو ہمارے ملک میں مدرسوں کو ان کی خدمت تعلیم کے عوض میں ملتی ہے۔ ممکن ہے اس بات میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سعودی حکومت تعلیم پر بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کر رہی ہے۔

۴۔ تعمیری و تمدنی ترقیوں پر بھی حکومت بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ملک میں بڑی تیزی کے ساتھ سڑکیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ تمام قصبات اور دیہاتوں کو سڑکوں کے ذریعہ سے شہروں سے ملایا جا رہا ہے۔ اس ملک میں سفر کی مشکلات جیسی کچھ رہی ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے لیکن اب سڑکوں اور موٹروں کی کثرت اور امن و امان کے قیام نے حالات بالکل بدل دیئے ہیں۔

جدہ اور مکہ معظمہ کی عمارتوں کی شان و شوکت دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ نئے دور کے کسی ترقی یافتہ شہر میں اُترے ہیں۔ جدہ اور مکہ معظمہ تو درکنار اب تو منیٰ میں بھی ایسے شاندار ہوٹل بن گئے ہیں جن پر لاہور اور کراچی کے ہوٹلوں کا دھوکا ہوتا ہے۔

شہروں میں پانی اور بجلی کا انتظام بھی اب اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ پانی کی کمی کی تمام پچھلی روایات اب افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔

۵۔ اسلامی تہذیب و معاشرت کے احترام کے پہلو سے بھی سعودی حکومت کا حال قابل تعریف ہے۔ خاص طور پر عورتوں میں پردے کی پابندی بہت شدت کے ساتھ موجود ہے۔ مجال نہیں ہے کہ سعودی حکومت کی کوئی باشندہ خاتون آپ کو بے پردہ نظر آجائے۔ اگرچہ اب گھروں کے اندر کی معاشرت بالکل مغربی طرز کی ہوتی جا رہی ہے۔ ریڈیو ٹیلیویژنوں کے اندر بھی آپ کو موجود ملے گا۔ لیکن عورتیں جب باہر نکلتی ہیں تو سیاہ برقعوں ہی میں نکلتی ہیں۔ میں نے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ یا جدہ میں اس کی خلاف ورزی کی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ سینماؤں، ناچ گھروں، قحبہ خانوں اور شراب خانوں کی ظاہری لعنتوں سے الحمدللہ یہ ملک اب تک پاک ہے۔

بعض قابل توجہ پہلو

ان قابل تعریف باتوں کے پہلو بہ پہلو بعض چیزیں مجھے محتاج اصلاح بھی محسوس ہوئیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اجمالاً ان کا بھی تذکرہ کر دوں۔

۱۔ مجھے سب سے زیادہ عرب قومیت کی وہ عصبیت کھٹکتی رہی جس کا صور اس زمانہ میں جمال عبدالناصر صاحب نے پھونکا تھا۔ مجھے قومیت کے تصور سے کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے اس تعصب سے اختلاف ہے جو مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان بھی دیواریں کھڑی کر دے۔ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان جامع رشتہ اسلامی اخوت کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ دوسرے تمام رشتوں سے زیادہ لائق احترام ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے تھوڑی سی تکلیف ہوئی کہ اب سعودی حکومت بھی بہت سے معاملات کو محدود قومی تصورات کی عینک سے دیکھنے لگی ہے اور ملکی اور غیر ملکی کا فرق یہاں بھی کیا جانے لگا ہے۔ جہاں تک بعض انتظامی نوعیت کی پابندیوں کا تعلق ہے ان کا اختیار کیا جانا تو ناگزیر ہے لیکن اس تصور کا فروغ پانا کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ تمام عربی بولنے والے بلا امتیاز ایمان و عقیدہ ایک الگ قوم ہیں اور دوسرے الگ قوم ہیں۔ مصر اور شام سے اس قسم کے نظریات کا اس زمانہ میں جنم لینا کچھ زیادہ عجیب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ زمانہ اس قسم کے فتنوں کے لیے بڑا سازگار ہے لیکن سرزمین پاک — حجاز — کے لیے یہی زیبا ہے کہ یہ اس قسم کے جاہلی نعروں سے غیر متاثر رہے۔ حرمین شریفین مسلمانوں کے بین الملی شہر بلکہ بین الملی مرکز ہیں۔ ان میں از روئے قرآن مقیم اور آفاقی دونوں قسم کے مسلمانوں کے حقوق بحکم سواءً العاکف فیہ والباد بالکل یکساں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح عرب کے رسول ہیں اسی طرح تمام عالم انسانی کے رسول ہیں۔ خانہ کعبہ جس طرح اہل عرب کا ہے اسی طرح اہل عجم کا بھی ہے۔ اہل عرب اس بات پر شکر تو بے شک کر سکتے ہیں کہ خدا نے عرب ہی کے ایک شہر کو اسلام کا مرکز بنایا لیکن وہ تمام رجحانات جو قومی عصبیت سے پیدا ہوتے ہیں، جاہلیت کے بقایا میں سے ہیں اور انتہائی صدمہ کی بات ہوگی اگر وہی لوگ ان کی پرورش کی ذمہ داری لے لیں جنھوں نے سب سے پہلے ان کو دنیا سے مٹانے کی سعادت حاصل کی تھی۔

۲۔ یہ چیز بھی ہمارے زمانہ قیام میں نمایاں طور پر محسوس ہو رہی تھی کہ یہاں برطانوی اور امریکی سامراج کے خلاف لوگوں کے جذبات اس قدر شدید ہیں کہ حریف یعنی روس کے لیے ان کے اندر ہمدردی پیدا ہو رہی ہے۔ بعض حضرات سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ معاہدہ بغداد کے یہ لوگ بڑے خلاف ہیں اور روس کو یہ لوگ اہون البلیتین خیال کرتے ہیں۔ میں نے ایک بزرگ سے ایک روز باتوں باتوں میں کہا کہ امریکہ اور برطانیہ سے بیزاری کے معاملہ میں تو میں آپ لوگوں کو حق بجانب سمجھتا ہوں لیکن اس بیزاری کے لیے یہ تو لازم نہیں ہے کہ آپ کو روس سے ہمدردی ہو جائے؟ ان کے جواب سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس کا تجربہ نہیں کیا ہے، امید یہی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ بہتر ہی ہوگا۔ میں نے کہا یہ خیال تو کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ لوگوں پر کالفار من الرمضاء الی النار والی مثل صادق آئے۔ یعنی ریت سے بھاگے، آگ میں کودے۔

میری جن حضرات سے گفتگوئیں ہوئیں، ان کی گفتگوؤں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کے لوگوں کی سیاسی رائیں عموماً معلومات اور دلایل سے زیادہ جذبات پر مبنی ہیں۔ اسی وجہ سے میرا گمان یہ ہے کہ اب ان رجحانات میں بہت بڑی حد تک تبدیلی واقع ہو گئی ہوگی کیونکہ عراق کے حوادث نے کمیونزم کا ایک ہلکا سا تجربہ اہل عرب کو کرا دیا ہے۔

۳۔ میں نے یہ چیز بھی محسوس کی کہ حجاز کے شہروں میں مصر و شام کے داعیٔ الحاد رسایل و اخبارات کی بڑی کھپت ہے۔ میں نے مصور وغیرہ جیسے رسایل بکثرت یہاں بکتے دیکھے۔ ان رسایل و اخبارات میں زیادہ تر عربی قومیت کے ابھارنے والے اور الحاد و اباحیت کی دعوت دینے والے مضامین ہوتے ہیں۔ فحش جنسی مضامین اور نیم عریاں تصاویر مزید برآں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کا نوجوان طبقہ ان رسایل کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا ہے۔ میں نے بعض نوجوانوں کو یہ رسایل جیبوں میں اڑسے ہوئے حرم میں پھرتے دیکھا۔

ان چیزوں کو اس زمانہ میں قانون کے ذریعہ سے روکنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جن نوجوانوں کے ہاتھوں میں یہ زہر پہنچ رہا ہے ان کے لیے اگر کچھ لوگ تریاق بہم پہنچائیں تو وہ بھی ان تک پہنچنے دیا جائے لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ رسالے تو ہر جگہ دھڑلے سے بکتے ہیں لیکن اگر کچھ لوگ، ان نوجوانوں کو اس طرح کی چیزیں پہنچانے یا پڑھانے کی کوشش کریں جس قسم کی

چیزیں جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے لوگوں نے شائع کی ہیں تو مجھے معلوم ہوا ہے کہ سعودی حکومت اس کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک یہ صورت حال نہایت تشویش انگیز ہے۔ یہ ہر مسلمان حکومت کی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ایمان و اخلاق کی حفاظت کرے۔ سعودی حکومت کا اول فرض تو یہ ہے کہ اس قسم کی فتنہ انگیز چیزوں سے اپنے نوجوانوں کو بچائے لیکن اگر وہ کسی مصلحت سے نوجوانوں کی اس آزادی میں خلل انداز ہونا پسند نہیں کرتی تو پھر اس کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے برے اثرات کے تدارک کی بھی فکر کرے اور ان کے لیے صالح فکری غذا کا بھی سامان کرے۔ یہ مسئلہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ حجاز ہمارا روحانی مرکز ہے۔ اس کا بناؤ اور بگاڑ سب پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۴۔ سعودی حکومت خدا کے فضل سے اب تیل کی رائلٹی کی بدولت ایک صاحب وسایل و ذرائع حکومت ہے۔ اب اگر یہ اپنی دولت صحیح تقسیم کے ساتھ ملک اور اہل ملک کی بہبود و ترقی پر خرچ کرے تو بڑی جلدی اس ملک کے ہر شعبہ زندگی میں ترقی و رفاہیت کے آثار نظر آنے لگیں۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ابھی ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ شاہی خاندان کے افراد کی ذاتی دلچسپیوں اور ان کی بیرونی سیروں اور سیاحتوں پر خرچ ہوتا ہے۔ شاید اسی چیز کا یہ نتیجہ ہے کہ یہاں کی ساری رفاہیت بس ایک نہایت ہی محدود طبقہ کے اندر سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ عام ملک اسی طرح غریب اور تنگ حال ہے جس طرح کبھی پہلے رہا ہوگا۔ شہروں میں تمدنی سامانوں کی وہ کثرت اور وہ چمک دمک ہے کہ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں لیکن ان چیزوں تک پہنچ بہت تھوڑے لوگوں کی ہے۔ زیادہ تر صرف ان لوگوں کی جو کسی نہ کسی نوعیت سے حکومت کے متوسلین میں ہیں۔ عام لوگ ابھی پیٹ کی روٹی کے مسئلہ سے زیادہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں اور روٹی حجاز میں ناقابل برداشت حد تک گراں ہے۔

پچھلے دنوں جلالۃ الملک اور امیر فیصل کے درمیان اختلاف رائے کی خبروں نے اخبارات میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ اس اختلاف رائے کا زیادہ تر تعلق ملکی خزانے کے اسی بیجا اسراف سے ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے ارباب حل و عقد اس صورت حال سے بے خبر نہیں ہیں۔ جلالۃ الملک کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ بڑے نرم مزاج

بادشاہ ہیں۔ نرم مزاج لوگوں میں جہاں یہ عیب ہوتا ہے کہ ان کی نرم مزاجی سے ذی اثر متملقین غلط فائدے اٹھا لیتے ہیں وہیں ان میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ وہ صحیح مشوروں کی قدر بھی کرتے ہیں۔ ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ اس ملک کی خداداد دولت افراد کی دلچسپیوں کے بجائے ملک کی ترقی اور بہبود پر خرچ ہو اور یہ ملک تمام مسلمان ملکوں کے لیے ایک اچھا نمونہ ہو۔

۵۔ حکومت کی توسیع تعلیم کی اسکیم کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اس کا یہ پہلو تو بڑا خوش آئند ہے کہ اس سے عوام کی جہالت دور ہوگی لیکن ساتھ ہی اس کا ایک پہلو تشویش انگیز بھی میرے علم میں آیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ تعلیم زیادہ تر مصری اساتذہ کے ہاتھ میں ہے اور ان اساتذہ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ بیشتر ملحد یا کم از کم دین سے بالکل بے پروا ہیں۔ مصری حضرات کے ذوق و رجحان کا اندازہ اسی ایک امر سے کیجیے کہ سعودی حکومت کے محکمہ حفظان صحت کے ڈائرکٹر مصری ہیں اور ان کا نام نامی حجاز ہی کے کسی اخبار میں میں نے فرعون رشاد پڑھا تھا۔ تعلیم بڑی اعلیٰ چیز ہے، لیکن غلط آدمیوں کے ذریعہ سے جو تعلیم دی جاتی ہے وہ مفید کم اور مضر زیادہ ہوتی ہے۔ جس سرزمین سے ساری دنیا کو ایمان و اسلام کی دولت نصیب ہوئی ہے، یہ کتنا بڑا حادثہ ہوگا اگر وہیں سے الحاد تقسیم ہونے لگے۔ ہر ملک کے ذمہ داروں پر اس ملک کے باشندوں کے دین و ایمان کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر سعودی حکومت اپنی اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئی تو اس کی تلافی حرمین کی توسیع کی اسکیم سے ہرگز نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ یہ اسکیم کتنی ہی شاندار ہو۔

۶۔ آزادی رائے کی نعمت سے اس وقت جس طرح تمام مشرق وسطیٰ محروم ہے اسی طرح حجاز بھی اس نعمت سے محروم ہے۔ یہاں کے اخبارات جہاں تک ظاہری ٹیپ ٹاپ کا تعلق ہے اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن اظہار رائے کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس اعتبار سے سرکاری، نیم سرکاری اور پبلک سارے ہی اخبارات کا مزاج بالکل ایک ہے۔ ان میں زیادہ تر شاہی احکام و فرامین اور سرکاری حکام کے دوروں کی تفصیلات چھپتی ہیں یا پھر درخواستیں اور عرض داشتیں۔ دینی رسائل کا معیار بھی کچھ اونچا نہیں ہے حالانکہ دل یہ چاہتا ہے کہ دین کی حجت قائم کرنے والے سب سے زیادہ بلند پایہ رسائل یہیں سے نکلیں۔ یہاں کے علماء کے متعلق معلوم ہوا ہے

کہ یہ حضرات زیادہ تر سرکار سے وظیفے پاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے اس توقع کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ حکمرانوں کو صحیح مشورے دینے کی جرأت کر سکیں گے۔ بعض علماء کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ حق نصیحت میں جری ہیں اور وہ نتائج سے بے پروا ہو کر اپنا یہ فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور ملک میں ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔

۷۔ یہاں میں نے کسی بڑے دینی و علمی ادارہ کی بھی کمی محسوس کی حالانکہ مرکز اسلام ہونے کی وجہ سے سب سے بڑا دینی و علمی مرکز اسی سرزمین پر ہونا چاہیے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جو مدرسے قائم ہیں وہ بالکل عام قسم کے ہیں۔ ریاض میں کسی بڑے علمی مرکز کے قیام کی اسکیم کی خبر سنی تھی اور اس کے لیے عبدالوہاب عزام مرحوم مصر سے بلائے بھی گئے تھے لیکن معلوم نہیں اب وہ کس مرحلہ میں ہے۔ اس وقت اسلام جس نازک دور سے گذر رہا ہے اس کے تقاضوں سے سعودی حکومت بے خبر نہیں ہو سکتی۔ آج جس قسم کے رجال اسلام کی ترجمانی کر سکتے ہیں اس قسم کے رجال پیدا کرنے کا کہیں بھی انتظام نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ وہاں بھی نہیں ہے جہاں سے ساری دنیا کو اسلام کی روشنی ملی تھی۔ سعودی حکومت اگر اس قسم کا کوئی مرکز قائم کرے تو وہ وقت کی سب سے بڑی دینی ضرورت پوری کرے گی۔ یہ کام اس کے کرنے کا بھی ہے اور اس کے لیے اس کے پاس وسائل و ذرائع بھی ہیں۔

امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور شیخ عبدالوہاب کی بعض کتابیں شائع کر کے سعودی حکومت نے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ شیخین کی تمام کتابیں نہایت اعلیٰ اہتمام سے چھاپ کر شائع کی جائیں اور سستے داموں فروخت کی جائیں۔ علاوہ ازیں دوسرے ائمہ اور علماء کی وہ کتابیں بھی چھاپی اور شائع کی جائیں جو دین کی حجت قائم کرنے والی ہیں۔ اس عہد زوال و انحطاط میں تو اسلام نہ صرف رجال دین سے بلکہ قدیم دینی کتابوں سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے۔ اگر سعودی حکومت یہ خدمت انجام دے تو حجاج کے واسطہ سے یہ کتابیں تمام اسلامی دنیا کے خادمان دین کو نصیب ہو سکتی ہیں اور کتابوں کے اس قحط کے زمانہ میں یہ خدمت کوئی معمولی خدمت نہیں ہوگی۔

۷۔ حجاج اور حرم سے متعلق جو امور قابل توجہ ہیں ان کی طرف میں مناسب مواقع پر اشارہ کرتا آیا ہوں البتہ ایک بات رہ گئی ہے اس کی طرف یہاں توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ حرم میں خواتین کے ساتھ

معاملہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ خواتین ہی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ حرم کے حبشی خدام ہی عورتوں اور مردوں دونوں کی چوکیداری کرتے ہیں۔ ان کا رویہ عام طور پر تو اچھا ہوتا ہے لیکن بسا اوقات وہ ایسا رویہ اختیار کرنے پر شاید مجبور ہو جاتے ہیں جو کم از کم عورتوں کے حد تک شریعت کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہوتا ہے۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہ ہے کہ حرم میں جس طرح مرد خدام مقرر کیے گئے ہیں اسی طرح کچھ خاتون خادمات بھی مقرر کی جائیں اور اگر ان کے مستقل طور پر مقرر کیے جانے میں کوئی زحمت ہو تو کم از کم زمانۂ حج کے لیے کچھ خواتین کی خدمات رضاکارانہ طور پر حاصل کی جائیں، اور مسجد نبوی اور بیت اللہ میں جہاں تک عورتوں کی نگرانی، ان کی روک ٹوک اور ان کو پانی پلانے کا معاملہ ہے اس طرح کے سارے کام ان کے سپرد کیے جائیں۔ ان رضاکار خواتین کے لیے حرم کی انتظامیہ کی طرف سے کوئی ایسا نشان مقرر کر دیا جائے جس سے ان کی ذمہ دارانہ حیثیت نمایاں ہو سکے۔

اسی طرح اگر خواتین کے طواف کے لیے کچھ اوقات مخصوص کر دیے جائیں تو غالباً شرعی نقطۂ نظر سے یہ بات کچھ قابلِ اعتراض نہ ہوگی اور اس سے دوسرے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان باتوں کے ذکر کرنے سے ہمارا مقصود سعودی حکومت کی تنقیص نہیں ہے۔ ہمارے دل میں جس طرح اپنی حکومت کے لیے عزت و احترام ہے اسی طرح سعودی حکومت کے لیے بھی عزت و احترام ہے۔ ان باتوں کی طرف ہم نے صرف خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور مقصود یہ ہے کہ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات مفید اور قابلِ قبول ہو تو وہ سامنے آجائے اور اربابِ حل و عقد اس کو لائقِ توجہ سمجھیں تو اس پر غور کر سکیں۔

بقیہ اسلامی قانون کی تدوین

اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں پر موجودہ زمانہ کے علمی انداز میں کتابیں لکھی جائیں اور یہ کتابیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اچھی طرح پھیلائی جائیں تاکہ اسلامی قانون کے خلاف لوگوں کی بدگمانیاں دور ہوں۔ اور جو لوگ اسلامی قانون کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں ان کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ اس مقصد کے لیے ان کو کتابیں نہیں ملتیں۔

تاریخ و سِیَر

عہدِ صحابہؓ کے سب سے کمسن مفسّرِ قرآن

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

(۲)

جامعیت قرآن کے ساتھ ابن عباسؓ کے اس شغف سے کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ وہ کوئی یک رخے قسم کے آدمی تھے، دوسری دینی و اسلامی یا ادبی و سیاسی چیزوں سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ قرآن ایک جامع کتاب ہے جس میں انسان کی علمی و عملی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر پہلو زیرِ بحث آیا ہے۔ اس وجہ سے کوئی یک رخے ذہن کا آدمی تو اس سے کماحقہ بہرہ اندوز ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے صحیح فائدہ تو وہی اٹھا سکتا ہے جو ایک جامع اور ہمہ گیر ذہن رکھتا ہو اور زندگی کے ہر پہلو پر اس کی نگاہ پہنچتی ہو۔ حضرت ابن عباسؓ کے حالات سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے وہ اسی قسم کے آدمی تھے۔ استیعاب میں عمرو بن دینار کا ابن عباسؓ کے متعلق یہ قول نقل ہوا ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کی مجلس سے زیادہ کسی کی مجلس بھی خیر کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لینے والی نہیں دیکھی۔ حلال و حرام بھی بیان ہو رہا ہے، عربیت اور شعر کی بحثیں بھی چل رہی ہیں، اور انساب کے چرچے بھی ہیں۔

عبیداللہ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے زیادہ کسی کو بھی سنت کا جاننے والا

معاملہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ خواتین ہی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ حرم کے حبشی خدام ہی عورتوں اور مردوں دونوں کی چوکیداری کرتے ہیں۔ ان کا رویہ عام طور پر تو اچھا ہوتا ہے لیکن بسا اوقات وہ ایسا رویہ اختیار کرنے پر شاید مجبور ہو جاتے ہیں جو کم از کم عورتوں کے حد تک شریعت کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہوتا ہے۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہ ہے کہ حرم میں جس طرح مرد خدام مقرر کیے گئے ہیں اسی طرح کچھ خاتون خادمات بھی مقرر کی جائیں اور اگر ان کے مستقل طور پر مقرر کیے جانے میں کوئی زحمت ہو تو کم از کم زمانۂ حج کے لیے کچھ خواتین کی خدمات رضاکارانہ طور پر حاصل کی جائیں، اور مسجد نبوی اور بیت اللہ میں جہاں تک عورتوں کی نگرانی، ان کی روک ٹوک اور ان کو پانی پلانے کا معاملہ ہے اس طرح کے سارے کام ان کے سپرد کیے جائیں۔ ان رضاکار خواتین کے لیے حرم کی انتظامیہ کی طرف سے کوئی ایسا نشان مقرر کر دیا جائے جس سے ان کی ذمہ دارانہ حیثیت نمایاں ہو سکے۔

اسی طرح اگر خواتین کے طواف کے لیے کچھ اوقات مخصوص کر دیے جائیں تو غالباً شرعی نقطۂ نظر سے یہ بات کچھ قابلِ اعتراض نہ ہوگی اور اس سے دوسرے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان باتوں کے ذکر کرنے سے ہمارا مقصود سعودی حکومت کی تنقیص نہیں ہے۔ ہمارے دل میں جس طرح اپنی حکومت کے لیے عزت و احترام ہے اسی طرح سعودی حکومت کے لیے بھی عزت و احترام ہے۔ ان باتوں کی طرف ہم نے صرف خیرخواہی کے جذبہ کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور مقصود یہ ہے کہ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات مفید اور قابلِ قبول ہو تو وہ سامنے آجائے اور اربابِ حل و عقد اس کو لائقِ توجہ سمجھیں تو اس پر غور کر سکیں۔

بقیہ اسلامی قانون کی تدوین

اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں پر موجودہ زمانہ کے علمی انداز میں کتابیں لکھی جائیں اور یہ کتابیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اچھی طرح پھیلائی جائیں تاکہ اسلامی قانون کے خلاف لوگوں کی بدگمانیاں دور ہوں۔ اور جو لوگ اسلامی قانون کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں ان کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ اس مقصد کے لیے ان کو کتابیں نہیں ملتیں۔

ترجمان قرآن اور حبر الامۃ کے اس اعزاز میں وقت کے صرف اہلِ علم ہی شریک نہیں تھے بلکہ وقت کے عوام بھی جہاں ان کو دیکھتے پروانہ وار ان پر نثار ہوتے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں شاہی ٹھاٹھ باٹھ کی تمام باتیں شروع ہو گئی تھیں لیکن جو کر و فر امیر معاویہ اپنے شاہی اقتدار کے زور و شور سے حاصل کر پاتے امت کے مفسرِ اعظم کو وہ کر و فر محض عوام کا ہجوم عقیدت فراہم کر دیتا۔ استیعاب میں یزید بن اصم کا ایک بیان نقل ہوا ہے کہ ایک مرتبہ امیر معاویہ حج کے لیے نکلے، حضرت ابن عباسؓ بھی ساتھ تھے، ایک طرف اگر امیر معاویہ کا موکب شاہی ہوتا جو ان کے خدم و حشم سے مرکب ہوتا تو دوسری طرف حبر الامۃ بھی جہاں اترتے وہاں ان کا ایک دربار لگ جاتا جو شائقینِ علم پر مشتمل ہوتا۔

علم قرآن کی اشاعت حضرت ابن عباسؓ نے نہ صرف یہ کہ اپنے ہم عصروں میں علمِ قرآن میں سب سے زیادہ اونچا درجہ پایا بلکہ اس اعتبار سے بھی یہ بڑے بڑوں سے بازی لے گئے کہ ان کے علومِ قرآنی کی دنیا میں جو اشاعت ہوئی وہ کسی کے علوم کی بھی نہیں ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے یہ دعا بھی فرمائی تھی کہ اللھم بارک فیہ وانشر عنہ (اے اللہ ان کو برکت عطا فرما اور ان سے نورِ علم کو پھیلا) اس دعا کی برکت دیکھیے کہ آج ابن عباس کی خوشہ چینی کے بغیر کوئی شخص تفسیر میں کلام کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ اس زمین پر ہزار انقلاب آجائے، لیکن حضرت ابن عباس کو جو مقام تفسیر میں حاصل ہو چکا ہے وہ انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ یہ بھی ان کی غیر معمولی مقبولیت ہی کی ایک دلیل ہے کہ بہت سے جھوٹے مدعیوں نے اپنی متاع کا سد ان کی طرف منسوب کر کے اس کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمارے اہلِ علم نے ایسی کسوٹیاں مقرر کر رکھی ہیں جن سے صحیح اور سقیم میں امتیاز ہو سکتا ہے۔

جلاوطنی اور وفات اس طرح مرجعِ خلائق بننا اگرچہ اس فضل و کمال کا قدرتی تقاضا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشا تھا لیکن یہیں سے ان کے لیے ابتلا کا بھی ایک دروازہ کھل گیا۔ مکہ میں ان کے دروازے پر ہر وقت عقیدت مندوں اور علم و ہدایت کے طالبوں کا جمگھٹا رہتا۔ استیعاب میں لکھا ہے کہ ایک دن عبداللہ بن صفوان بن امیہ کا ادھر سے گذر ہوا تو اس نے دیکھا کہ حضرت ابن عباسؓ کے دروازے پر طلبہ اور مستفتیوں کا ایک ہجوم ہے۔ آگے بڑھا تو ان کے بھائی عبیداللہ بن عباسؓ کا مکان تھا، وہاں لوگوں کو کھانا تقسیم ہو رہا تھا، اور کھانا لینے والوں کا اژدحام تھا۔ دونوں بھائیوں کی

مقبولیت اور مرجعیت کی یہ شان دیکھ کر عبداللہ بن صفوان، ابن زبیر کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ اب تو آپ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں۔

فان تصبك من الايام مقارعة — لم نبك منك على دنيا ولا دين

(اب اگر زمانہ کی کوئی گردش آپ کو ہلاک کر دے تو ہم آپ پر نہ دین کی خاطر روئیں گے نہ دنیا کی خاطر)

ابن زبیر نے کڑک کر پوچھا اے اعرج! اس کا کیا مطلب؟ اس نے کہا میں ابھی ابھی عباسؓ کے دونوں بیٹوں کو دیکھتا ہوا چلا آ رہا ہوں (ایک نے فیضان علم کا لنگر جاری کر رکھا ہے اور دوسرے نے لوگوں کے لیے کھانے کا لنگر جاری کر رکھا ہے) اب اور کون سی فضیلت ہے جو انھوں نے آپ کے لیے چھوڑ دی ہو؟ ابن زبیر یہ بات سُن کر کھٹک گئے۔ فوراً عبداللہ بن مطیع کو بُلوایا اور اس کے ہاتھ حضرت ابن عباسؓ اور ان کے بھائی کو پیغام بھجوایا کہ آپ دونوں صاحبان اپنے تمام عراقی ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں ورنہ میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ابن زبیر سے کہا کہ ہمارے ہاں دو طرح کے لوگ آتے ہیں، ایک وہ جو علم کے طالب ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو خیرات کے طالب ہوتے ہیں۔ آپ ان دونوں میں سے کس چیز کو روکنا چاہتے ہیں؟

ابن زبیر حضرت ابن عباسؓ کی اس معقول بات کا تو کوئی جواب دے نہیں سکتے تھے لیکن ان کی عارضی حکومت چونکہ اضطراب کی حالت میں تھی اس کے پیش نظر وہ ایک شخص کی اس مرجعیت کو آسانی کے ساتھ گوارا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کو جلاوطن کر کے طائف بھیج دیا۔ وہیں عالم غربت میں انھوں نے ستر سال کی عمر میں ۶۸ ہجری میں وفات پائی۔ محمد بن حنفیہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور فرمایا کہ آج اس امت کا ربانی اٹھ گیا۔

—— خریدار حضرات ——

خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

مینیجر